افسانہ نگار

سید نوشاد کاظمی (مظفر آباد آزاد کشمیر)





مسافرت

14 افسانے

سید نوشاد کاظمی



مسافرت

سید نوشاد کاظمی

مسافرت

(افسانے)

از: سیدنوشادکاظمی

ناشر: تھذیب انٹر نیشنل پبلیکیشنز

بہاولپور، لاہور، اسلام آباد، کراچی

0300-8881856, 0333-4076188

باشتراک : باقر پبلیکیشنز لاہور

0300-8073510

نام کتاب	:	مسافرت
مصنف کتاب	:	سیدنوشادکاظمی
صفحات	:	160
ناشر	:	تہذیب انٹرنیشنل پبلی کیشنز
تاریخ اشاعت	:	اکتوبر 2016ء
کمپوزنگ	:	محمد صدیق قریشی / محمد یونس عطاری
خصوصی تعاون	:	ڈاکٹر سید فہیم رضا چشتی الکاظمی چیئرمین فروغ ادب فاؤنڈیشن پاکستان (بہاولپور)
قیمت	:	-/350 روپے
زیر اہتمام	:	جگنو انٹرنیشنل لاہور

منگوانے کا پتہ: شمع بک ایجنسی نیو اردو بازار کراچی

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

سیدنوشادکاظمی مظفرآباد (آزاد کشمیر)

0301-5344759

فروغ ادب فاؤنڈیشن پاکستان (بہاولپور)

0333-4076188

0300-3738564

انتساب

بخدمت اقدس

پاک باطن، شفیق ہستی

مرشد کریم

حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی مدظلہ العالی

سید نوشاد کاظمی

تاثرات

پیش لفظ

سیدنوشادکاظمی جن کا تعلق آزادکشمیر کے دارالخلافہ مظفرآباد سے ہے،تقریباً گذشتہ بیس برسوں سے لکھ رہے ہیں۔ان کے افسانے ،مضامین اور آرٹیکلز متعدد اخبارات اور رسائل وجرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔مختلف رسالوں اور جرائد کے لیے بھی لکھتے رہے ہیں۔ان کے افسانوں کے زیادہ تر موضوعات ہمارے معاشرے کا دوغلہ پن ہے۔تصوف کو بھی انہوں نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ادبی تنظیم ''جگنوانٹرنیشنل'' کی طرف سے انہیں ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔برصغیر پاک وہند کے پچاس ممتاز افسانہ نگاروں میں ان کا نام بھی شامل ہے۔موصوف اس وقت تک تقریباً تیس (30) افسانے لکھ چکے ہیں اور ان کا یہ قلمی سفر جاری ہے۔علاوہ ازیں ٹی وی کیلئے مختصر ڈرامے بھی لکھے ہیں اور ہماری تاریخ کے نامور اسلاف کے شاندار علمی ورثہ کو ڈراموں اور دستاویزی فلموں کی شکل میں ڈھال کر الیکٹرانک میڈیا سے پیش و محفوظ کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔

اللہ رحمٰن ورحیم سے دُعا ہے کہ ان کی تمنائیں پوری فرمائے (آمین)۔

ڈاکٹر سید فہیم رضا کاظمی الچشتی

چیئرمین فروغ ادب فاؤنڈیشن پاکستان

''تاثرات فخر اولیاء حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی''

سب سے زیادہ شفیق ہستی معروف بین الاقوامی روحانی اسکالر (مرشد کریم) حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی مدظلہ کی خدمت میں کتاب ''مسافرت'' کا مسودہ بذریعہ محترم ایاز صاحب سرکولیشن منیجر ماہنامہ ''قلندر شعور'' پیش کیا گیا۔انہوں نے شدید بیماری کی حالت میں مسودہ دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا اور بیماری کے باعث خود ''تاثرات'' قلمبند نہ کر سکنے کی وجہ سے محترم ایاز صاحب سے فرمایا کہ ''بتا دیا جائے کہ وہ (میں) خود ہی تاثرات لکھ لے، اچھا لکھ لے گا'' لیکن میں یہ ہمت نہیں کر سکا کہ جلیل القدر ہستی کی طرف سے تاثرات لکھوں۔غور وخوض کے بعد ان کا لکھا ہوا ایک مضمون ''صدائے جرس'' کا ایک اقتباس تاثرات میں شامل کیا گیا ہے۔

تاریخی شواہد یہ ہیں کہ ساری دنیا ایک ڈرامہ ہے۔ایسا ڈرامہ جس میں الگ الگ کرداروں کے ساتھ بے شمار کہانیاں ہیں۔ ہر کہانی کا آغاز ایک طرح ہوتا ہے اور ہر کہانی ایک ہی انجام پر ختم ہوتی ہے۔ کہانی در کہانی یہ دنیا عجیب دنیا ہے۔کہانی کا ہر کردار سمجھتا ہے کہ میں ایک نئی دنیا ہوں، لیکن یہاں کوئی بھی بات نئی نہیں ہے۔

انسان نے تاریخ کے نام پر کتابوں کے اتنے انبار لگا دیئے ہیں کہ اگر ان سب کو سمندر میں ڈال دیا جائے تو سمندر میں ایک جزیرہ بن جائے گا۔ان اربوں، کھربوں کتابوں کے مطالعہ سے انسانی ذہن نے یہ نتیجہ اختراع کیا ہے کہ زمین پر تین زمانے محیط ہیں۔

ماضی۔حال۔مستقبل۔

بڑے بڑے دانشور، فلسفی، حکماء، سائنسدان، ماہر نفسیات، ماہر ارضیات اور نہیں معلوم کتنے شعبوں کی ماہرین یہ بات ثابت نہیں کر سکے کہ تین زمانوں ماضی حال اور مستقبل کی حیثیت کیا ہے۔کیا واقعتاً زمین ان تین دائروں میں مقید ہے؟ کیا کوئی بھی پیدا ہونے والا انسان ماضی، حال اور مستقبل کے دائروں میں بند ہے؟

میں ایک بندہ بشر ہوں۔ میری زندگی ایک کتاب ہے۔ اس کتاب میں زندگی کے نشیب وفراز، ماہ وسال، شب وروز چھپے ہوئے ہیں۔ اسی طرح زمین پر موجود ہر بشر ایک کتاب ہے۔ جتنے سال یہ بشر دنیا میں رہتا ہے، کتاب زندگی میں اتنے ہی ورق ہیں۔ میں اگر **70** سال کا بوڑھا تو میری کتاب زندگی میں ستر ورق ہیں۔ ورق کا ایک صفحہ مظاہراتی دنیا ہے اور ورق کا دوسرا صفحہ ماورائی دنیا ہے۔

زندگی کا پہلا ورق یہ ہے کہ میں نے اس دنیا میں قدم رکھا۔ ایک سال تک اس ورق پر نقش ابھرتے رہے اور نقوش زندگی بنتے رہے۔ دوسرے سال بھی پہلے سال کے نقوش گہرے ہوتے رہے۔ نتیجہ میں زندگی کے دو سالہ دو ورق بن گئے۔ پھر ان اوراق میں اضافہ ہوا، لیکن نقوش میں تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔

کتاب زندگی دس صفحے کی ہوئی، بیس صفحے کی ہوئی، تیس صفحے کی ہوئی، چالیس صفحے کی ہوئی، ساٹھ صفحے کی ہوئی اور جب ستر، اسی سال کے اوراق پورے ہوئے تو کتاب زندگی بند ہوگئی۔

اس عمل کو اہل دانش ارتقائی عمل قرار دیتے ہیں۔ ارتقائی عمل بھی خوب ہے کہ کسی ایک نقطہ پر جا کر ختم ہو جاتا ہے اور اس طرح ختم ہو جاتا ہے کہ وجود ناپید اور ہستی عدم ہو جاتی ہے۔

دانشوروں کے ارتقائی عمل پر غور وفکر کیا جائے تو ذہن کی اسکرین پر یہ سوال ابھرتا ہے کہ **70/80** سال کی زندگی حال اور مستقبل کس طرح ہوئی؟ یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ زمین پر موجود ہر شے، ہر تخلیق، ہر نوع، نوع انسانی کا ہر فرد ماضی ہے اور سارا ارتقائی عمل ماضی کا **REPETITION** ہے۔

ہمیں پیاس لگتی ہے، لیکن اگر ماضی میں پانی موجود نہ ہو تو پیاس نہیں بجھتی۔ بھوک لگتی ہے، لیکن اگر ماضی میں خورد ونوش کا سامان نہ ہو اور تسلسل نہ رہے تو بھوک رفع نہیں ہوتی نوع انسان کا پہلا فرد ابو بشر آدم اگر ماضی میں نہ ہوتا تو نسلِ انسانی کے وجود کا تذکرہ ہی نہ ہوتا۔

یہ کیسی منطق ہے کہ ماضی کے **REPETITION** کو حال اور مستقبل کا نام دیا جا رہا ہے جبکہ ماضی پھیل رہا ہے اور سمٹ رہا ہے۔ ماضی پھیلتا ہے تو اس کو ارتقاء کہہ دیا جاتا ہے اور ماضی سمٹتا ہے تو اس کا نام تنزل رکھ دیا جاتا ہے۔

اندرون بین نظر سے دیکھا جائے تو زمین اور پوری کائنات ماضی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔
زمین پر پیدا ہونے والا بچہ، ابوالبشر آدم کی تصویر ہے جو **NEGATIVE** سے **POSITIVE** بن رہی ہے۔ **NEGATIVE** سے **POSITIVE** تصویر کو حال اور مستقبل کیسے کہا جا سکتا ہے؟

آج پیدا ہونے والے بچے میں **70،80** سال چھپے ہوئے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ اس بچے میں کیمیائی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ یہ کیمیائی تبدیلیاں پہلے سے موجود روشنیوں میں تبدیلیاں ہیں۔ ان

تبدیلیوں کی وجہ سے بچہ دو دائروں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ ایک کو محسوس دنیا اور دوسری کو غیر محسوس دنیا سمجھا جاتا ہے۔ دانشوروں کے نزدیک محسوس دنیا قابل اعتماد ہے اور غیر محسوس دنیا اس لیے قابل اعتماد نہیں ہے کہ وہ آنکھوں کے سامنے مظہر نہیں بنتی۔ حالانکہ غیر محسوس دنیا پیدا ہونے والے بچے کے لیے بنیاد ہے۔ اس لیے کہ جو بھی بچہ اس دنیا میں آتا ہے، وہ اس دنیا سے آتا ہے جو نظروں کے سامنے نہیں ہے۔

بچے کے اندر بتدریج جب کیمیائی یا شعاعی تبدیلیاں ہوتی ہیں تو رفتہ رفتہ طبیعت کے لیے یہ تبدیلیاں معمول بن جاتی ہیں۔ کبھی حواس کے اوپر ان کا غلبہ زیادہ ہو جاتا ہے اور کبھی یہ غلبہ کم ہو جاتا ہے۔ تبدیلیوں کا کم یا زیادہ ہونا ردعمل ہے۔ جب تک ردعمل رہتا ہے، طبیعت کو اس کو نہیں دہراتی اور جب ردعمل ہو چکتا ہے تو طبیعت دہرانے لگتی ہے۔ قانون یہ ہے کہ ردعمل محض وقتی ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ:

لوگوں کی یہ پرانی عادت ہے کہ جب ہمارا قاصد پیام لے کر ان کے پاس جاتا ہے تو وہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ان لوگوں کی بے یقینی کا یہ عالم ہے کہ اگر ہم آسمان کے دروازے کھول دیں اور چڑھنے کے لیے ان کو زینہ مل جائے اور یہ سارا دن چڑھتے رہیں مگر یہی کہے جائیں گے کہ ہماری نگاہ پر جادو کر دیا ہے۔ ہم تو نظر بندی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ہم نے آسمانوں کے الگ الگ حصے کر دیئے ہیں اور ان کو مختلف طرزوں پر آباد کیا ہے البتہ اس آباد کاری کو نظر والے ہی دیکھ سکتے ہیں اور جو شیطان مردود بے یقین ہے، اس کی نگاہ سے ان آبادیوں کو مخفی کر دیا ہے۔ وہ ان بستیوں کو نہیں دیکھ سکتا لیکن جو لوگ چور دروازوں سے ان آسمانوں میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں، انہیں آگ کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔
(القرآن: سورہ الحجرات)

کائنات میں ہر چیز کا ایک تشخص ہے۔ یہ تشخص ہی پھیلتا اور سمٹتا رہتا ہے۔ یہ تشخص کائنات کی تخلیق سے پہلے ہی متعین کر دیا گیا ہے۔ جب ہم کائنات کی تخلیق سے پہلے کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس کا مطلب ماضی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ یہ تشخص ہی حقیقی ہے خواہ وہ ذرہ میں ہو، ستارے میں ہو، چاند میں ہو، سورج میں ہو، زمین میں ہو یا انسان میں ہو۔

انسان کا کوئی بھی کردار پہلے سے ماضی میں ریکارڈ ہے۔ ماضی میں موجود کسی بھی کردار یا صلاحیت کو انسان جتنا بیدار کر لے اتنی ہی وہ صلاحیت بیدار ہو جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہاں پر انسان ڈاکٹر بھی ہے، انجینئر بھی ہے، ٹیچر بھی ہے اور ادیب بھی ہے۔ جو شخص انجینئر ہونا چاہیے وہ اپنے اندر موجود ریکارڈ انجینئرنگ کی صلاحیت کو بیدار کر لے تو وہ انجینئر بن جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص ڈاکٹر بننا چاہتا ہے تو وہ

اپنے اندر موجود ڈاکٹر کی صلاحیت کو بیدار کر لے تو ڈاکٹر بن جاتا ہے اور جو شخص ادیب بننا چاہیے، شاعر بننا چاہے وہ اپنے اندر موجود صلاحیت کو بیدار کر کے شاعر اور ادیب بن جاتا ہے۔ جو شخص اپنی ذات (ماضی) سے باخبر ہو جاتا ہے وہ ایسی دنیا میں داخل ہو جاتا ہے، جہاں رنج والم، عدم تحفظ، پریشانی، بے سکونی اور ذہنی انتشار نہیں ہے۔ جس درجے میں جدو جہد اس صلاحیت کو بیدار کرنے میں اجاگر ہو گی اس ہی مناسبت سے وہ کامیاب ہو جائے گا اور جب کوئی شخص اپنی صلاحیتوں کی حقیقت اور مکمل کارکردگی سے بے خبر رہتا ہے، تو اپنی ذات کا جائزہ نہیں لے سکتا وہ یہ نہیں جان سکتا کہ اس کی ذات کہاں تک محیط ہے اور یہی انسان کی سب سے بڑی محرومی ہے۔

خواجہ شمس الدین عظیمی

خانوادہ سلسلہ عالیہ عظیمیہ

کراچی (پاکستان)۔

نوشادکاظمی۔۔۔۔۔صوفی افسانہ نگار۔۔۔

ادب زندگی کا آئینہ دار ہے۔ جیسے جیسے انسانی قدریں آگے بڑھیں ویسے ویسے ادب میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہیں۔۔ ابتدا میں جو افسانے لکھے گئے وہ مغربی تقلید میں رومان پسندی کے جذبے سے سرشار ہو کر لکھے گئے جن کے روح و رواں سجاد حیدر یلدرم، مجنوں گورکھپوری، نیاز فتحپوری، حجاب امتیاز علی جیسی شخصیات تھیں۔ چالیس کی دہائی تک رومانیت کے ساتھ ساتھ حب الوطنی اور حریت پسندی افسانے کا موضوع رہے۔ 1932 میں پریم چند کے افسانے ''انگارے'' نے ہندوستانی سماج میں کہرام پیدا کر دیا کیونکہ یہ پہلا اتفاق تھا کہ افسانے میں اس حد تک باغیانہ خیالات اور جارحانہ انداز اختیار کیا گیا تھا۔ زوال پذیر معاشرے میں اس بے باکی اور جراءت کا مظاہرہ اس سے پہلے اس انداز میں نہیں ہوا تھا۔ یہ سچ ہے کہ افسانے نے ان تبدیلیوں کو غیر جانبداری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ نوشاد کاظمی کے افسانوں کا مجموعہ ''مسافرت'' بھی کچھ ایسے ہی تیوروں کے ساتھ منصۂ شہود پر آیا ہے۔۔ ان کے افسانوں میں ایک طرف تو پریم چند کی دیہاتی روایت ہے تو دوسری تصوف سے گہری دلچسپی رکھنے کے باوصف قدرت اللہ شہاب، ممتاز مفتی اور اشفاق احمد کا صوفیانہ فلسفہ بھی ہے۔ جسے موصوف نے خوب نبھایا ہے۔ ''اجنبی بیرسٹر'' میں رامن کی بیوی تندیب ہر طرف سے مایوس ہو کر اپنے میاں کو ''بابا تاج الدین ناگپوری'' کے پاس جانے کا مشورہ دیتے ہوئے اسے کس انداز میں آمادہ کرتی ہے، ملاحظہ کیجئے۔

''وہ مسلمانوں کے دھرم کے ہیں، تو پھر کیا ہے؟ یہ دھرم ورم کے چکر تو ہم لوگوں نے بنا رکھے ہیں۔ مرہٹہ راجہ جی نے تو انہیں اپنے محل میں ٹھہرایا رہا مہاراجہ جی روزانہ خود ان کی قدمبوسی کرتے تھے۔ کیا راجہ جی کا دھرم بھشٹ ہو گیا؟؟......تو ان چکروں میں نہ پڑ میری سن!.......... اور ابھی سے جا......وہ کسی آم کے پیڑ کے نیچے ہی بیٹھے ہوں گے......بس اس وقت تک ان کے

پاس سے نہ اٹھنا، جب تک ہماری رہن شدہ زمین ہمیں مل نہیں جاتی۔۔۔'' پھر یہی ہوا رامن کا دل 'بابا تاج الدین ناگپوری کی محبت کا ایسا اسیر ہوا کہ اس کے دل کی دنیا ہی بدل گئی۔ بابا تاج الدین ناگپوری نے دونوں بھائیوں کی طرف نظریں بھر کر دیکھا اور فرمایا۔''یہ سب اللہ کی کرپا ہے رے'' وہ رامن جسے سارے دھرم ایک سے لگتے تھے مسلمانوں کے دھرم میں بھی اس نے نچلے طبقے کا استحصال دیکھا تھا۔ اسکے ساتھ کام کرنے والے اکثر مسلمان کاشتکاروں اور محنت کاروں کی حالت بھی اس جیسی ہی تھی، بلکہ اس سے بھی بدتر وفروتر مسلمان نواب تھے، جاگیردار تھے، لیکن نچلے محروم طبقہ کے مسلمانوں کی حالت زارا چھوتوں سے ملتی جلتی تھی ۔ اگر کچھ فرق تھا تو صرف یہ تھا کہ انہیں ان کے دھرم والوں نے اچھوت اور ملیچھ کا نام نہیں دیا تھا۔۔ ورنہ تھے تو دونوں ایک جیسے لیکن بابا تاج الدین ناگپوری کے لہجے کے سوز نے رامن کے دل میں الوہیت کی چنگاری روشن کردی۔ اس کی آنکھیں چھلک پڑیں اور بے ساختہ وہ بابا تاج الدین کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ دھرانے لگا۔ ''سب اللہ کی کرپا ہے رے''۔ بس یہی وہ لمحہ تھا جب اس کا گیان مکمل ہوگیا اور آنے والے چار پانچ برسوں میں لوگوں نے دیکھا کہ رامن اپنا دھرم بدل کر ''خیر بخش'' بن گیا تھا، جس نے اپنے محلّہ میں مسجد تعمیر کروالی تھی اور جو بےنوا و درماندہ، محنت کش، ہندو مسلم آبادی کے دکھوں کا مشترکہ مداوا بن چکا تھا۔

عشق تصوف کا خاص موضوع ہے۔ مولانا روم اکے بقول، ''عشق ایک جست میں زمان ومکان والی کائنات سے آگے نکل جاتا ہے۔ فسانہ ''لکشمی'' کی کہانی میں ایک ہندو دوشیزہ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ ایک مسلمان فقیر کے فیضانِ نظر سے عشق الٰہی میں اپنا سب کچھ ہار کے فنافی اللہ ہوگئی۔ اپنا گھر، دھرم، سب بھول گئی۔ فقیر درویش کی ایک نظر نے اس کے باطن کو ایسا منور کیا کہ اس روشنی میں سب کچھ دھندلا گیا۔ بصارت نے بصیرتوں کے در وا کئے تو ہر وقت غشی کی کیفیت میں رہنے لگی۔ ہوش آیا تو تب جب اس کے کانوں میں مسلمانوں کی مسجد سے اذان کی آواز سنائی دی۔

''عصر کے وقت مسلمانوں کی مسجد سے ''اللہ اکبر'' کی صدا بلند ہوئی تو لکشمی اچانک اُٹھ بیٹھی۔ اس نے حیران و پریشان نظروں سے سب کی طرف دیکھا اور پھر ہنس دی۔ رمیش نے آگے بڑھ کر لکشمی کو پیار سے پکارا۔ ''لکشمی لکشمی''، لیکن لکشمی کچھ نہ بولی پھر

وہ مسلمانوں کی مسجد سے پکاری جانے والی اذان کے الفاظ دھرانے لگی۔ سب حیران وششدر لکشمی کو دیکھ رہے تھے، لکشمی اذان کے الفاظ دھرا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے جلال ٹپک رہا تھا۔ لکشمی نے آخری الفاظ زوردار لہجے میں دوبار دھرائے۔ اللہ اکبر۔۔ اللہ اکبر۔۔ لا الہ الا اللہ۔ پھر لکشمی کو ایک شدید جھٹکا لگا تھا اور پلنگ پر ہی دم توڑ گئی''۔ (لکشمی)

نوشاد کاظمی افسانوی ادب میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند کے پچاس ممتاز افسانہ نگاروں میں ان کے نام کا شمار ہونا صرف ان کے لئے نہیں بلکہ ہم سب کے لئے بھی فخر کا مقام ہے۔ ان کے افسانے بیانیہ ہیں لیکن ان میں مکالمہ نگاری کے خوبصورت نمونے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ وہ کہانی کے اختتام پر اس قسم کی فضا پیش کرتے ہیں کہ قاری اسے ختم کرنے کے بعد کسی نہ کسی خاص سمت میں سوچتا رہے۔ اور یہ ایک ادیب کے لئے بہت کامیابی کی بات ہے۔

''سنو.......... جب انسان کے اندر کثافت بھر جائے تو وہ کچھ بھی کرسکتا ہے اور جب کوئی فرد دوسروں کی حق تلفی کرتا ہے تو اس کے باطن سے فکر سلیم کے تمام نشانات مٹ جاتے ہیں.......... ہمارے معاشرے کا بالا دست طبقہ نہایت چالاک، ہوشیار، سفاک اور ظالم ہے''۔ (گاؤں کا اسسٹنٹ ڈائریکٹر)

ایک اور افسانے ''پوڈری'' میں بھی قوم کا لہو چوسنے والے، منشیات جیسی لعنت سے اپنا کاروبار چمکانے والے، اور نسلِ نو کی رگوں میں یہ نشہ اُتار کر انہیں ناکارہ کرنے والوں کی نشاندہی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ 'جب سرمایے کے بل بوتے پر قومی رہنما ایوانوں میں پہنچتے ہوں تو قوم کو ''عبدالباری'' جیسے تحفے ملتے ہیں............... جو ایک ادارہ کا بانکا اوورسیئر تھا، اوپر کی آمدن بھی کافی تھی، پھر اسے ہیروئین کی ایسی لت پڑی کہ پہلے نوکری چھوٹی، پھر گھر کو بھی اس نے خیر آباد کہہ دیا۔ آخر کار نالہ کے اس پل کے نیچے اس نے اپنا ٹھکانہ بنالیا۔ آمدن کا ذریعہ تو ختم ہوگیا تھا ،لیکن نشہ کی طلب بڑھ گئی تھی، جس کے لیے پہلے وہ چھوٹی موٹی چوریاں کرتا رہا، جب جسم کی سکت جواب دے گئی، تو نشہ کی خاطر بھیک مانگنا شروع کردی۔ جس وقت اس نے نیا نیا نشہ شروع کیا تھا تو منیجر نے اسے منسٹر صاحب کے لڑکوں کو ہیروئین پر لگانے کا ٹارگٹ دیا تھا، کیونکہ منسٹر صاحب کے لڑکوں کا اس کے پاس اٹھنا بیٹھنا تھا، مگر عبدالباری کی بدقسمتی کہ وہ ایسا نہ کرسکا۔ اور ایک معمارِ قوم نشانِ عبرت بن گیا۔ اوپر سے نیچے تک منشیات فروشوں کا باقاعدہ

ایک نیٹ ورک چھایا ہوا تھا۔ پولیس کے اعلیٰ آفیسران اور حکومت کے اہم وکلیدی عہدے دار اس کاروبار میں ملوث تھے۔ حتیٰ کہ یہ لوگ انتظامی سطح پر اتنے طاقتور تھے کہ تجارتی مال ہمسایہ ملک میں لے جانے والے ٹرکوں پر بھی منشیات سمگل کر لی جاتی تھیں اور جگ ہنسائی کا باعث بنتی رہتی تھیں۔ صحافی، ایڈیٹرز، رپورٹرز اور قلمکار، سب ان کے آگے بے بس تھے۔

نوشاد کاظمی کے افسانے زندگی سے بہت قریب ہیں۔ ہر افسانہ ایک کہانی ہے۔ جو معاشرے کے اندر بڑھتی ہوئی منافقانہ سوچ اور اُن رویوں کے خلاف ایک احتجاج ہے جہاں اداروں کے ایماندار آفیسران کو اس طرح الجھا کر پھنسا دیا جاتا ہے کہ ان کے ہاتھ پیر بندھ جاتے ہیں اور وہ کچھ نہیں کر پاتے اس کے برعکس کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو جتنا زیادہ ایماندار ہے، اتنا ہی زیادہ اسے کرپٹ بنا کر دکھایا جاتا ہے، سچ ہی تو ہے جہاں آوے کا آوا بگڑا ہو وہاں ایمانداری کے درخت پر پھل نہیں لگتا۔ ''گاؤں کا بابو'' میں 35 سال بعد ایک بیگناہ کی بیگناہی کا اعتراف اس وقت کیا گیا جب وہ اور اس کے اہلِ خانہ نا کردہ گناہ کی سزا بھگت کر راہِ عدم کو کوچ کر چکے تھے۔ ہمارے معاشرے کے عدم استحکام اور گراوٹ کا ایک سبب یہاں بالا دستوں کی اجارہ داری، میرٹ کی بجائے اثر ورسوخ، نا اہلوں کی سفارشی بھرتیوں اور پھر ان کی پشت پناہی کرنے والوں کا اعجاز ہے۔ ''گاؤں کا اسسٹنٹ ڈائریکٹر''، ''پکّی بیٹھک'' ، اور ''قربانی'' میں انہی سفاک حقائق کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔ ''تاباں پیر'' کا کردار مذہب کے ٹھیکیداروں کا مذہب کے نام پر استحصال کی کامیاب عکاسی ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ

''قدرت کی گرفت ہمیشہ دبے پاؤں آتی ہے اور آدمی کو اس طرح جکڑ لیتی ہے کہ آدمی کو کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ آدمی کی آنکھیں اس وقت کھلتی ہیں، جب وہ بند گلی میں پہنچ جاتا ہے''۔ (پیالی پیر) نوشاد کاظمی کے اس مجموعے میں چودہ افسانے ہیں جو معاشرتی ناہمواریوں کا نوحہ بھی ہیں اور احتجاج بھی۔ ان کا تعلق مظفر آباد کی وادیوں سے ہے۔ اپنی مٹی اور ثقافت کی خوشبو ان کی ہر سطر سے عیاں ہے۔ افسانوں میں دیہاتی منظر کشی میں بھی مظفر آباد کے دیہاتوں کو موضوع بنایا ہے۔ انہوں نے انسانی زندگی کے متعدد پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھا ہے کہیں وہ ایک مصلح کی طرح سچائی کے دودھ سے منافقت کا پانی الگ کرتے دکھائی دیتے ہیں اور کہیں ایک ماہر منصوبہ باز کی طرح اداروں کی بدحالی پر کڑھتے ہیں۔ جہاں تعلیمی استعداد کی

بجائے، سفارش اور میرٹ کی بجائے طبقۂ بالا تک رسائی معیار ہیں۔ یہ کسی ایک محکمہ کا نہیں بلکہ مجموعی کلچر بن چکا ہے۔، ناانصافی، اقربا پروری، سیاسی اثر ورسوخ نے قوم کی جڑوں کو کھوکھلا کر رکھا ہے۔ سارے کا سارا نظام ہی اوندھا لیٹے سسکیاں لے رہا ہے لیکن ستم تو یہ ہے کہ ان کی اشک شوئی کرنے والا بھی کوئی نہیں۔ اہل، قابل اور تعلیم یافتہ طبقہ نفسیاتی مسائل کی دلدل میں اُترا ہوا ہے ۔ ارے کوئی تو ہو جو انہیں اس دلدل سے نکالے! جب ادارے ایسے افراد کے ہاتھوں میں ہوں تو بہتری کی صورت کیسے دکھائی دے؟ یہ ایک حقیقت ہے کہ جہاں آوے کا آوا بگڑا ہوا ہو، وہاں ایمانداری کے درخت پر پھل نہیں لگتا۔

''زونل چیف صاحب بظاہر تو گریجویٹ تھے، لیکن ان کی علمی استعداد آٹھویں، نویں جماعت کے طالب علم سے زیادہ نہ تھی۔ چنانچہ دفتری نظام بگڑنے کا سارا نزلہ زونل چیف صاحب کی ایڈمنسٹریشن پر پڑ رہا تھا۔ انہیں کچھ سمجھ نہ آئی کہ پروڈکٹس کی ترسیل واندراج کے شعبے کو کس طرح فعال کیا جائے۔ تو ان کے ذہن میں یہی بات نقش ہو چکی تھی کہ ''سلیم بابر'' ہر فن مولا ہے۔ اور ترسیل واندراج کا کام بھی جانتا ہے۔ ان کی فہم یہ جاننے سے قاصر تھی کہ سلیم بابر پہلے سے تقریباً چار پانچ ماہر لوگوں کا کام کر رہا ہے۔ اور آڈٹ واکاؤنٹس کے دو شعبے مکمل طور پر اس کے سپرد ہیں اور ان شعبوں میں جو چار پانچ کلرک کام کر رہے ہیں، وہ دفتر منہ دکھانے کے لیے بھی نہیں آتے''۔ (گاؤں کا بابو)

نوشاد کاظمی کے افسانے دراصل کہانیاں ہیں جہاں رومانیت نام کو نہیں سادہ، سلیس اور شستہ زبان میں سماجی ومعاشرتی استحصال کی منظر کشی کی ہے۔ ان کے کردار بولتے ہیں۔ وہ کہیں سے مستعار نہیں لئے گئے بلکہ آج کے پُر آشوب دور کی چلتی پھرتی تصویریں ہیں جن سے ہم ہر روز ملاقات کرتے ہیں۔ انہوں نے ایک ماہر نباض کی طرح ہماری معاشرتی بیماریوں کی، جو ناسور بن چکی ہیں صرف تشخیص ہی نہیں کی بلکہ ایک سرجن کی طرح جراحی بھی کی ہے۔ اُن کی اس مسافرت نے اُن پر جو در وا کئے ہیں وہ تازہ ہوا کا جھونکا ہیں۔ جس نے پاؤں کے آبلوں کو بھی خوشبوؤں کا راستہ دکھایا ہے۔ خوشبو کا یہ سفر نہ صرف ان کو معطر رکھے گا بلکہ اوروں کو بھی گلِ گلزار ہونے کا گُر سکھائے گا۔ مجھے خوشی ہے کہ ان کی اس ''مسافرت'' میں جگنو انٹرنیشنل بھی ہمرکاب

ہے۔نوشادکاظمی کے ساتھ ساتھ صاحبِ تصوف شاعروادیبِ ڈاکٹرفہیم کاظمی بھی مبارکباد کے مستحق ہیں جنھوں نے اس گلبن کوشاداب رکھنے کا اہتمام تہذیب انٹرنیشنل پبلی کیشنزاور باقر پبلی کیشنز کے اشتراک سے کیا ہے۔یہ مسافرت یونہی جاری وساری رہی تو ضرور منزلِ مرادتک پہنچے گی۔ انشاءاللہ !

ایم زیڈ کنول

چیف ایگزیکٹو، جگنوانٹرنیشنل، لاہور

۔۔ایڈیٹر۔۔۔احساس، جرمنی۔

’’معرفت کے گوہرانمول‘‘

’’مسافرت‘‘افسانوں کا مجموعہ ہی نہیں انسان کی ذات سے کائنات کا سفر، سوچ کو کردار میں ڈھالنے کا سفر، مکاں سے لامکاں کا سفر، اندھیروں سے اجالوں کا سفر، خودغرضی سے بےخودی کا سفر ، بت پرستی سے بت شکنی کا سفر، اورشرک سے الوہیت کا سفر، یہی نہیں بلکہ جذبۂ شوق سے عشق مجازی کا سفراور عشق مجازی سے عشق حقیقی ہے جوقاری کو نہ صرف ساتھ لے کر چلتا ہے بلکہ اسے رموز ذات، رموز کائنات اور خالقِ کائنات سے آشنا کرتا ہے۔ان کے افسانے انسانی عمومی رویوں پر مشتمل وہ کہانیاں ہیں جوروزمرہ کی زندگی میں ہمارے اردگرد جنم لیتی ہیں جنہیں انہوں نے سپردقلم کرتے ہوئے اپنے خلوص اور صادق جذبوں کی روشنائی سے اس طرح روشن کیا ہے کہ معرفت کا نور کبھی اپنے جلالی اور کبھی جمالی رنگ میں ظاہر ہوکر قاری کو روشنی عطا کرتا ہے۔ایسی روشنی جو درون خانہ کے مخفی اندھیروں کو مسافرت عطا کر کے اجالوں کے نگر میں لے جاتی ہے۔افسانوں میں بین السطور مصنف کا درددل، ہمدردئ خلائق، تعلق باللہ، عشق حقیقی اس طرح ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک افسانہ نگار سے بڑھکر ایک ناصح اور مصلح محسوس ہوتا ہے۔

معاشرتی ناہمواروں، معاشی عدم استحکام، ذہنی کشمکش اور قلبی کیفیات کومتحرک اور جاندار کرداراداکر کے اصلاحِ معاشرہ اور اصلاحِ نفس عام فہم زبان میں اس روانی اور سلاست کے ساتھ کی گئی ہے کہ قاری اس مسافرت میں خودکو بھی مسافرمحسوس کرتا ہے اوراس صوفی افسانہ نگار کے آستانے سے نصائح اور معرفت کے گوہرانمول لئے بامرادلوٹتا ہے

شفیق مراد

چیف ایگزیکٹو

شریف اکیڈمی جرمنی

"پیش لفظ"

کوئی آدمی اپنی مرضی سے پیدا نہیں ہوتا اور نہ کوئی آدمی اپنی مرضی سے مرتا ہے۔ آدمی اپنا دل جو احساسات و جذبات کا مخزن ہے، خود نہیں بناتا اور نہ کوئی شخص جذبات و احساسات اور خیالات پر قادر ہے۔ حتیٰ کہ انسانی ذہن کی ساخت، میلانات و رجحانات، پسند و ناپسند، اخذ و انتخاب کی طرز بھی اپنی مرضی سے منتخب نہیں کی جا سکتی۔ یہ سب کچھ انسان کی کوششوں کا ثمر نہیں ہوتا، بلکہ عطیہ خداوندی ہوتا ہے۔ اس کے باوجود علمی و ادبی دنیا میں بڑے بڑے ناقد گزرے ہیں۔ تجزیہ نگار پیدا ہوئے ہیں۔ جنہوں نے نتائج اخذ کیے ہیں۔ حالانکہ کوئی بھی نتیجہ آدمی کی مرضی سے مرتب نہیں ہوتا۔ بس ایک ایسا مخفی نظام ہے، جس کی ڈوریاں حرکت میں آتی ہیں تو نتائج مرتب ہو جاتے ہیں۔ حالات اور ماحول پیدا ہو جاتا ہے اور فکر کی، احساس کی، میلان کی ایک مخصوص "رو" پروان چڑھتی ہے، لیکن یہ "رو" یا لہر بھی کسی ماورا چیز کے تابع ہے اور اس ماورائی "رو"، چیز یا لہر تک شاید کوئی بھی رسائی حاصل نہیں کر سکا ہے۔ اس کے باوجود انسان یہ سمجھتا ہے کہ میں حالات پر قادر ہوں، میری محنت ہے، میری کاوشوں کا ثمر ہے۔ بھلا کیسے کسی کی محنت اور کاوش کا "ماحصل" ہو سکتا ہے۔ ایک آدمی جو حالات کی سخت ترین بھٹی سے گزرتا ہے اور جن حالات سے وہ گزرتا ہے، ان کو احساس کے ذریعے الفاظ کے جامہ میں سمو کر کاغذی پیرہن پہناتا ہے۔ یہی شخص اگر مخصوص ماحول اور گھرانے میں پیدا نہ ہوتا تو اس کی

شخصیت بدل جائے گی۔ اس پر کوئی دوسرا رنگ چڑھ جائے گا۔ حالانکہ اس کی "انا" بالکل ایک ہی کیوں نہ ہو۔ دراصل ہم اپنے مخزن احساسات کو اغراض کے ملبے تلے داب دیتے ہیں اور بعض اوقات یہ اغراض اور مادیت کی چپک سے بالکل ہی دم توڑ دیتا ہے۔ یہی اغراض کا حصار اور مادیت کی چپک ہے، جس سے قارون "قارون" بنا، فرعون، "فرعون" بنا اور ہماری آج کی دنیا میں مالدار و سرمایہ دار "سرمایہ دار" بنتا ہے۔ یہ سب دراصل ایک ہی قبیل کے لوگ ہیں۔ بس کسی کا قد اتنا بڑھ گیا کہ وہ تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہو گیا اور جس کا قد کاٹھ کمزور رہ گیا، تاریخ نے اس پر تاریکی کی سیاہی انڈیل دی۔

میرے نزدیک انسان کا سب سے قیمتی سرمایہ اس کا احساس ہے۔ اس کا جذبہ ہے اور یہ ایسا سرمایہ ہے کہ جو انمول ہے۔ زیر نظر کتاب "مسافرت" میرے 14 افسانوں کا مجموعہ ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ میں نے نہیں لکھا ہے بلکہ اس احساس نے لکھوایا ہے، جو میرے احساس کا احساس ہے۔ قارئین، ناقدین اور ادب کے ماہرین یہ افسانے پڑھ کر کیا رائے قائم کرتے ہیں۔ یہ تو وقت پر منحصر ہے، لیکن میرے احساس میں جو کچھ ابھرا ہے، وہ الفاظ اور پیرائیوں کی صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر اللہ نے چاہا تو مزید افسانے بھی جو مختلف رسائل و جرائد اور اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں، طباعت کروانے کا ارادہ ہے۔

یہ بات شاید ناقابل فہم قرار پائے کہ دراصل دنیا میں ہر ذہن، کسی ایسے قوی ذہن کے تابع ہوتا ہے، جس سے اس عام ذہن نے اپنی فکری ارتباط قائم کیا ہے۔ عام ذہن کی مسافرت اپنے نقطہ آغاز سے اس سمت ہوتی ہے، جس سمت کے اذہان کے اثرات اس نے قبول کیے ہیں۔ ہر چیز سفر کر رہی ہے اور یہ مسافرت طویل تر ہے۔

جس کا کہیں اختتام نہیں، کوئی حد نہیں۔ سب سے بنیادی مسئلہ مسافرت کی سمت کے تعین کا ہے۔ یہ افسانے دراصل میں اس بناء پر لکھ پایا ہوا ہوں کہ میرے ذہن میں مرشد کریم (حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی) کی ذات گرامی کی ہوا کا شاید کوئی جھونکا گھس آیا تھا ورنہ میرا ذہن واحساس، تاریک وادیوں میں کہیں دفن ہو جاتا۔

میں محترم جناب ڈاکٹر وقار یوسف عظیمی (جو آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی APNS اور کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹر CPNE کے متعدد بار عہدیدار منتخب ہو چکے ہیں) چیئر مین قلندر شعور فاؤنڈیشن کراچی پاکستان، نائب صدر آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی، ایڈیٹر ماہنامہ روحانی ڈائجسٹ کا انتہائی مشکور ہوں، جنہوں نے افسانہ نگاری کے حوالہ سے میری نہ صرف بھرپور راہنمائی کی بلکہ مسلسل حوصلہ افزائی بھی کرتے رہے۔

برادرم ڈاکٹر سید فہیم رضا چشتی الکاظمی چیئر مین فروغ ادب فاؤنڈیشن پاکستان کا خصوصی طور پر ممنون ہوں جنہوں نے اس کتاب کی اشاعت میں اپنا بھرپور تعاون فرمایا اور محترمہ ایم زیڈ کنول صاحبہ چیف ایگزیکٹو جگنو انٹرنیشنل اور محترم مرزا شوکت راہی کا بہت بہت مشکور ہوں، جنہوں نے قدم قدم پر میری حوصلہ افزائی کی۔ ہر طرح سے تعاون فرمایا۔

اللہ تعالیٰ انہیں دنیاوی زندگی کی بہاریں ورونقیں اور اخروی زندگی میں صالحین ومقربان الٰہی کا ساتھی بنائے۔ (آمین)

سید نوشاد کاظمی (مظفر آباد آزاد کشمیر)

جنوری 2016

فہرست

☆☆☆☆☆

لکشمی

آزاد کشمیر کے دارالحکومت مظفرآباد میں
محو استراحت حضرت سائیں سخی سہیلی سرکارؒ
کی زندگی کے تاریخ واقعہ سے ماخوذ
عشق کی ضرب سہنے والی ایک
ہندو دوشیزہ کی کیفیات پر مبنی افسانہ

رمیش بہت پریشان تھا۔ وہ آج چند گھڑیوں کے لیے ہی اپنی زیورات کی دوکان کھول پایا تھا۔ اس کی پتنی لکشمی کی حالت بہت بگڑ چکی تھی۔ لکشمی کی خیریت دریافت کرنے کئی خواتین متعدد مرتبہ اس کے گھر آچکی تھیں۔ بلکہ رمیش کی خالہ زاد کوشیلا تو صبح سے ہی اس کے گھر میں تھی۔ سب سے بڑی الجھن تو یہ تھی کہ یہ معلوم ہی نہ ہو پا رہا تھا کہ آخر لکشمی کو کیا ہوگیا ہے؟ ابھی بمشکل رمیش دوکان کھول کر جھاڑ پونچھ کر رہا تھا کہ اس کی پتنی کی دلسوز چیخیں بلند ہونا شروع ہوگئی تھیں۔ تھوڑی دیر پہلے تو وہ بھلی چنگی تھی اور یہ افتاد اچانک ہی آپڑی تھی۔ اس کی پتنی جسے وہ سال بھر پہلے بیاہ کر کے لایا تھا، نے اچانک زور زور سے بین کرنا شروع کر دیا تھا.......... ہزار کوشش کے باوجود اس نے رونے کی کوئی وجہ نہ بتائی اور چاشت کے وقت تک وہ رو رو کر نڈھال ہوئی، پھر بے ہوش ہوگئی اور اب عصر کا وقت قریب آگیا تھا، مگر وہ ہنوز بے ہوش تھی اور اکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہی تھی................ رمیش کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے؟.......... ہاں گزشتہ چند ماہ سے لکشمی خاموش رہنے لگی تھی۔ اس میں وہ شوخی اور شرارت نہ رہی تھی جو شادی کے بعد ابتدائی مہینوں میں تھی۔ رمیش سمجھ رہا تھا کہ ہر عورت میں شادی کے بعد وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سنجیدگی آجاتی ہے، لیکن لکشمی کے بارہ میں رمیش سمجھتا تھا کہ شاید گھر میں مسلسل تنہا رہنے سے اس کی طبیعت پر خاموشی حاوی ہوچکی ہے

..........مگر اسے کیا معلوم کہ معاملہ کچھ اور ہی تھا................

رمیش سری نگر کا رہنے والا تھا۔ اس کے تین بھائی تھے۔ ان لوگوں کے والد سونے کا کاروبار کرتے تھے۔ رمیش بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ بڑے تین بھائیوں کو پتا جی نے سرینگر اور کپواڑہ میں کاروبار سیٹ کر کے دیا تھا................ ''لکشمی'' رمیش کی پسند تھی۔ پتا جی نے بڑے چاؤ سے رمیش کی شادی کی تھی اور پھر کئی دنوں کی سوچ و بچار کے بعد پتا جی نے رمیش کو کشمیر کے شہر مظفرآباد میں زیورات کی دوکان ڈال کر دی تھی..........ان دنوں کشمیر پر مہاراجہ پرتاب سنگھ کی حکومت تھی۔ پتا جی بڑے سیانے اور دور اندیش تھے..........انہوں نے رمیش کے کاروبار کے لیے موزوں جگہ کا انتخاب کیا تھا، جہاں رمیش نے دوکان ڈالی تھی وہاں تجارتی قافلے پڑاؤ ڈالتے تھے۔ راولپنڈی اور صوبہ سرحد کے تمام تجارتی قافلے اسی جگہ پڑاؤ ڈال کر سرینگر کے لیے روانہ ہوتے تھے۔ یہ مقام سرینگر اور راولپنڈی کے تقریباً وسط میں پڑتا تھا۔ تمام تجارت بیل گاڑیوں کے ذریعے ہوتی تھی۔ راولپنڈی سے زیادہ تر آنے والے قافلے نمک اور دیگر اجناس سرینگر لے جاتے تھے اور سرینگر سے اخروٹ، سیب اور چاول لاتے تھے۔ کشمیر کے چاول اپنی شہرت اور خوشبو میں ضرب المثل تھے۔ یہ تمام قافلے اس جگہ قیام کرتے تھے جہاں دریائے جہلم اور نیلم آپس میں ملتے ہیں۔ اس مقام کا نام ''دومیل'' پڑ گیا ہے۔ پڑاؤ کی وجہ سے یہاں رونق بڑھ جاتی۔ قرب و جوار کے دیہاتی قافلہ والوں کے ہاں مختلف اشیاء فروخت کرنے اس مقام پر آتے اور قافلوں کے پڑاؤ کے دنوں میں یہاں خوب ریل پیل ہوتی۔ یہاں پر مہاراجہ کشمیر نے ایک سہ دری بنوائی ہوئی تھی۔ جہاں چند سرکاری اہلکاروں اور چند فوجیوں کی رہائش گاہیں تھیں، جو یہاں ڈیوٹی سرانجام دیتے تھے۔ مہاراجہ کی حکومت ان قافلوں سے ٹیکس بھی اسی مقام پر وصول کرتی تھی۔ تمام سامان تجارت کی چیکنگ بھی اسی مقام پر ہوتی تھی ....رمیش کے پتا جی نے اندازہ لگا لیا تھا کہ آنے والے وقت میں یہ جگہ مشہور تجارتی مرکز کی حیثیت اختیار کر لے گی۔ چنانچہ انہوں نے رمیش کو یہاں زیورات کی دوکان ڈال دی تھی۔ دوکان کے اوپر رمیش نے لکڑی کا بنا ہوا دومنزلہ گھر بھی خرید لیا تھا۔ وہ صبح دوکان پر چلا جاتا اور لکشمی گھر کے تمام کام کاج نبٹا کر دوسری منزل کی بالکونی میں بیٹھ کر مناظر فطرت کا نظارہ کرتی رہتی۔ لکشمی کو سوائے اپنے شوہر کا کھانا تیار کرنے کے علاوہ کوئی کام نہیں تھا۔ لکشمی کا سسرال سرینگر میں تھا۔ اس طرح دور کے رشتے کی ایک خالہ کے علاوہ کوئی قریبی رشتہ دار بھی ایسا نہ تھا کہ لکشمی دل

بہلانے کی خاطر اس کے ہاں چلی جاتی..................بس وہ دن بھر بالکونی میں بیٹھی رہتی۔ مکان کے نیچے سے سرینگر جانے والی سڑک تھی اور سرینگر کی ڈل جھیل سے بہہ کر آنے والا دریائے جہلم، جو چند گز آگے بڑھ کر دریائے نیلم میں مل جاتا۔ پھر دونوں دریا ہم آغوش ہو کر کسی بپھرے ہوئے شیر کی طرح پہاڑوں سے ٹکراتے بہتے چلے جاتے۔ دریائے نیلم کا پانی بالکل شفاف تھا۔ اتنا شفاف کہ صبح دھوپ کی کرنیں پڑنے پر محسوس ہوتا کہ سچے موتیوں کا ریلا بہتا چلا آ رہا ہے..................البتہ دریائے جہلم قدرے گدلا تھا۔ لکشمی اکثر بالکونی میں بیٹھ کر دیکھتی کہ آٹھ دس بیل گاڑیوں پر مشتمل قافلے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے آتے۔ جن کے آگے جتے بیلوں کے ماتھوں پر موتیوں سے پروئے گئے سہرے سجے ہوتے۔ بیل گاڑیوں کی چھتوں پر بیل بوٹوں والی جھانجریں لٹک رہی ہوتیں۔ پگڑی باندھے کندھوں پر دھوتیاں رکھے، پاؤں میں گھاس کے جوتے پہنے توانا جسم کے گاڑی بان بیلوں کو ہانک کر گاڑیاں قطار میں لا کر کھڑی کرتے۔ پھر نیچے اترتے، لدی گاڑی کا بغور معائنہ کرتے............پھر گاڑی میں لدی بوریوں پر بڑے بڑے موٹے کپڑے لپیٹ دیتے۔

اس کام سے فراغت پا کر وہ گاڑیوں میں جتے ہوئے بیلوں کو کھول کر دریائے جہلم کے کنارے کشادہ جگہ پر لے جاتے۔ جہاں بیل پانی پیتے..........پھر دیکھتے ہی دیکھتے اردگرد کے دیہاتوں سے مسلمان دیہاتی سروں پر چارے اور گھاس وغیرہ کے گٹھے اٹھائے آ جاتے۔ گاڑی بان بھاؤ تاؤ کر کے یہ چارہ خرید کر بیلوں کے آگے دریا کے کنارے بنی ایک بہت طویل ''کھرلی'' میں ڈال دیتے۔ بیل گھاس کھانا شروع کر دیتے۔ اس دوران گاڑی بان اپنی اپنی گاڑیوں پر لدے سامان کی تفصیل بتا کر مہاراجہ کشمیر کے اہلکاروں سے ٹیکس کی پرچی کٹواتے، پھر سرائے میں کھانا کھانے چلے جاتے..................کھانا کھانے کے بعد وہ بیلوں کو تھپتھپاتے ہوئے ہانک کر لاتے، بیل گاڑیوں میں جوتتے۔ بیلوں کے کندھوں کا بغور معائنہ کرتے اور بعض اوقات اگر کسی بیل کا کندھا زخمی ہوتا تو وہ اپنی پوٹلی کھول کر چھوٹی سی ڈبیا سے زرد رنگ کی مرہم نما چیز نکال کر بیل کے کندھوں پر لگا کر مالش کرتے اور اپنے سفر پر نکل جاتے..................آہستہ آہستہ رینگتی ہوئی بیل گاڑیوں کی لمبی قطار بن جاتی............بیلوں کے گلوں میں لٹکی گھنٹیاں بجنے لگتیں، جن کی آوازیں میلوں دور تک سنائی دیتیں۔ قرب و جوار کی زیادہ تر آبادی مسلمانوں کی تھی۔ یہ سب غریب اور مزدور پیشہ لوگ تھے۔ کاروبار پر ہندو آبادی چھائی ہوئی تھی۔ لکشمی دیکھتی کہ اس جگہ سب دوکانیں کھشتریوں

کی تھیں۔ گرد و نواح کے مسلمان دیہاتی کنستروں، مٹی اور تانبے کے بڑے بڑے برتنوں میں دیسی گھی لاتے اور کھشتریوں کے ہاں فروخت کر کے اشیائے خورد و نوش خرید کر چلے جاتے..................لکشمی کے پڑوس میں دو چار مسلمان گھروں کے علاوہ سب آبادی ہندوؤں یا سکھوں کی تھی۔ لکشمی کو یہ چہل پہل دیکھنے کی عادت سی ہو گئی تھی..................اور یہ سب دیکھے بغیر اسے سکون نہ آتا..................

ایک دن حسب معمول وہ گھر کے کام کاج سے فراغت پانے کے بعد ایک قافلے کو دیکھ رہی تھی............یہ قافلہ راولپنڈی سے آ کر یہاں ٹھہرا تھا۔ رمیش نے ناشتہ کر کے ابھی ابھی دوکان کھولی تھی۔ سورج دھیرے دھیرے مشرق سے بلند ہو رہا تھا، جس کی میٹھی اور سکوت بھری کرنوں میں پورے دن کا ہنگامہ سمویا ہوا تھا۔ لکشمی کی نظریں سبز چغہ پہنے ایک مسلمان فقیر پر پڑیں جو مستانہ وار اک ادائے دلنوازی سے ہجوم کے بیچوں بیچ سبک خرامی سے چلا آ رہا تھا۔ قافلہ کے لوگ اسے جھک کر سلام کرتے..........کسی نے اسے سیب پیش کیے اور کسی نے اخروٹ کی گریاں..................لیکن فقیر نے کسی سے کچھ نہ لیا۔ وہ ہر ایک کو غور سے دیکھتا اور آگے بڑھ جاتا..................لکشمی دیکھتی رہی۔ چلتے چلتے فقیر آگے بڑھا یہاں ایک دیہاتی اپنے گاؤں سے لائی گئی ناشپاتیاں ٹوکرے میں سجائے بیٹھا تھا۔ فقیر نے ٹوکرے سے ناشپاتی اٹھا کر کھائی اور چل دیا..........چند ہی لمحوں بعد غریب دیہاتی کے اردگرد ہجوم جمع ہو گیا اور انہوں نے اس سے سب ناشپاتیاں خرید لیں۔ دیہاتی نے خالی ٹوکری ہاتھ میں اٹھائی اور سر پر پگڑی باندھ کر خوشی خوشی چلا گیا..........لکشمی بالکونی سے اٹھنا ہی چاہتی تھی کہ اس نے دیکھا کہ فقیر پھر واپس آ رہا ہے۔ بالکل آہستہ آہستہ گہری سوچوں میں مستغرق۔ چلتے چلتے وہ عین بالکونی کے سامنے نیچے پہنچ گیا..........اور..................اور نظریں اٹھا کر لکشمی کی طرف دیکھا..........لکشمی کو ایسے لگا جیسے اس کے اندر تیز برقی رو دوڑ گئی ہے۔ اس کے جسم میں شدید حرارت پیدا ہوئی۔ دل میں انجانے تاسف و الم کی ہوکیں اٹھنے لگیں۔ جذبات و تلاطم کا ایک سمندر موجزن ہو گیا..........فقیر کی آنکھوں میں بجلی سے تیز چمک تھی۔ لکشمی کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور اداسی، بے نیازی کی ایک ایسی انجانی کیفیت پیدا ہوئی کہ اسے یہ سارا منظر، یہ ساری دنیا محض بے حس کارٹون نظر آنے لگی۔ لکشمی اپنی جگہ جمی کی جمی رہ گئی۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ اس دنیا میں موجود نہیں ہے اور

دور کہیں بہت دور اسے اپنی دنیا کے مناظر ایک شیڈ کی مانند نظر آرہے تھے۔ بغیر کسی وجہ کے دل میں سوز وگداز کی موجیں ٹھاٹھیں مارنے لگیں.......... اس لمحے اسے محسوس ہونے لگا جیسے وہ اس دنیا کی باسی نہیں ہے، نہ یہ گھر اور نہ اس کا خاندان اس کا ہے۔ وہ بمشکل دل تھام کر بالکونی سے اٹھی اور اپنے کمرے میں جا کر پلنگ پر بے سدھ لیٹ گئی۔ کھڑکی سے سورج کی کرنیں اندر جھانک رہی تھیں، جن میں بھینی بھینی خوشبو رچی بسی تھی۔ اس کی نظروں میں رہ رہ کر فقیر کا سراپا گھوم جاتا.............. دل میں جذبات کی ایسی چنگاریاں پھوٹتیں کہ بے اختیار آنکھوں سے آنسو چھلک پڑتے.......... اسے ہر چیز بدلی بدلی لگ رہی تھی.......... اور دل ہر چیز سے بے نیاز ہوتا چلا جا رہا تھا.......... وہ دوپہر تک یوں ہی نڈھال پڑی رہی۔ تاہم آہستہ آہستہ اس کی نارمل حالت بحال ہونے لگی۔ اسے رمیش کا خوف لاحق ہو گیا کہ اسکے کھانا کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ یہ سوچ کر وہ اٹھی اور تیزی سے کھانا تیار کرنے لگی۔

اس کی بدلی بدلی کیفیت رمیش سے چھپی نہ رہ سکی۔ اس نے کھانے کھاتے ہوئے اس سے متعدد بار پوچھا "لکشمی! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟ کچھ کچھ چپ چپ لگ رہی ہو؟" لکشمی نے جواب دیا۔

"بالکل ٹھیک ہوں، وہ بالکونی میں بیٹھے بیٹھے سو گئی.......... دھوپ لگنے سے سر میں درد ہو رہا ہے" .... دوسرے دن بالکونی میں بیٹھے لکشمی کے دل میں پھر شدید خواہش ابھری کہ مسلمان فقیر پھر ادھر سے گزرے۔ وہ فقیر کا انتظار کرنے لگی۔ سورج خاصا اوپر چڑھ آیا تھا۔ یہ ماہ اکتوبر کے ابتدائی ایام تھے۔ اس ماہ میں سورج کی تمازت کم پڑ جاتی ہے۔ کشمیر کے بلند و بالا آسمان سے باتیں کرتی ہوئی چوٹیوں نے سفید برف کی چادر اوڑھ لی تھی۔ دیہاتوں میں لوگ فصل اور گھاس کاٹنے میں مصروف تھے۔ سورج کی کرنوں سے ہلکی ہلکی میٹھی تپش کا احساس ہو رہا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ خوب دھوپ سینک لی جائے۔ لکشمی کے حواس پر ایک سکوت چھاتا جا رہا تھا۔ دھیرے دھیرے مشرق افق سے سورج کو بلند ہوتے دیکھ کر لکشمی کو ایسا لگا کہ یہ لمحات، یہ وقت ہمیشہ کے لیے ساکت ہو جائے۔ لکشمی کے حواس جلا پانے لگے۔ لکشمی کی

نظریں برابر فقیر کو تلاش کر رہی تھیں.......... لیکن فقیر ابھی تک نہ آیا تھا۔ اب دھوپ کی حدت بڑھ چکی تھی اور لکشمی کی پیشانی پر پسینے کے ننھے منے قطرے چڑھ آئے تھے۔ سردیوں کے دنوں میں دھوپ میں بیٹھنا بہت ہی بھلا لگتا ہے۔ لکشمی کو دھوپ میں بیٹھ کر توانائی کا احساس ہو رہا تھا، لیکن آج اسے اپنے گھر کے سامنے مناظر فطرت بے کیف سے لگ رہے تھے۔ لوگوں کی آمد و رفت اور چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔ مگر یہ سب اس کے لیے بے معنی تھے.......... اسے تو انسانوں کے اس ہجوم میں صرف ایک شخص کی تلاش تھی، جو اس کے لیے بظاہر بالکل اجنبی تھا، لیکن لکشمی کے حواس کا مرکز بن گیا تھا۔ وہ شخص نہ تو اس کے دھرم کا تھا اور نہ اس سے کسی طرح کی شناسائی تھی..........

لکشمی کو اپنے پتی سے بے انتہا محبت تھی اور رمیش بھی اس کا عاشق تھا۔ رمیش ایک بانکا، سجیلا کشمیری نوجوان تھا تو لکشمی نازکی، دلکشی اور حسن بے مثل کا پیکر تھی۔ رمیش اور لکشمی کا جوڑا خوب سجتا تھا۔ رمیش انتہائی وجیہہ مرد تھا۔ اس کا لمبا قد، نہایت متناسب ورزشی جسم، سب سے بڑھ کر وہ دل کی گہرائیوں سے ٹوٹ کر اسے چاہتا تھا.......... پھر.......... اسے ایک مسلمان فقیر کا انتظار کیوں ہے؟ .... لکشمی اٹھی، اس نے اپنے محبوب شوہر کے لیے کھانا تیار کیا.......... اس دن فقیر نظر نہ آیا تو لکشمی بیاکل رہی.......... رمیش گھر آیا۔ کھانا کھایا اور لکشمی کے لیے سونے کی چوڑیاں لائیں اور کرید کرید کر لکشمی کا چھپا کرب جاننے کی کوشش کرتا رہا.......... لیکن لکشمی کو تو خود معلوم نہ تھا کہ اسے کون سا روگ لگ گیا ہے، وہ رمیش کو بھلا کیا بتاتی!!

دوسرے دن لکشمی پھر صبح بالکونی میں جا بیٹھی۔ آج بھی اسے مسلمان فقیر کا شدت سے انتظار تھا۔ دل میں ایک عجیب سی بے کلی تھی۔ وہ بالکونی میں سراپا انتظار بیٹھی رہی۔ لوگوں کی بھیڑ تھی مگر اس کی نگاہیں صرف ایک شخص کو تلاش کر رہی تھیں۔ اچانک لکشمی کی نظر فقیر پر پڑی.......... وہی کل والا مسلمان فقیر سبز چغہ پہنے دھیرے دھیرے چلتا آ رہا تھا۔ جب فقیر بالکونی کے سامنے سڑک پر پہنچا تو اس نے لکشمی کی طرف تبسم کے ساتھ دیکھا اور آگے بڑھ گیا۔ اس کے دیکھنے سے ایک نظر نہ آنے والا صوتی جھونکا اس کے دماغ میں گونجا "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" اور پھر یہی کلمات لکشمی کے

لبوں سے جاری ہو گئے۔اس کے دیکھنے سے لکشمی کو ایسے لگا جیسے اس کے دل میں انواع واقسام کی بجلیاں کھل اٹھی ہیں۔دل میں جلترنگ سے پھوٹنے لگے۔لکشمی پر شادمانی، سرمستی وخودمستی کی ایسی حالت طاری ہو گئی جسے بیان کرنا الفاظ کے ذریعے ناممکن تھا۔اس کے رگ و پے میں مسرت کا احساس جاگزیں ہو گیا تھا۔نہ جانے فقیر کی نظروں میں کون سا ایسا طلسماتی اثر تھا کہ لکشمی بے خود ہو گئی۔پھر اس پر نیند کا غلبہ ہونے لگا اور وہ وہیں دھوپ میں بیٹھی بیٹھی سو گئی اور دل سے لا الہ الا اللہ محمد رسولؐ اللہ کی صدائیں اٹھنے لگیں.................

لکشمی کی آنکھ اس وقت کھلی جب رمیش نے غصے میں اسے جھنجھوڑ کر جگایا۔وہ اسے زور زور سے پکار رہا تھا۔

"لکشمی..........لکشمی..........کیا ہو گیا ہے تجھے..........؟ تو پسینے میں بھیگ چکی ہے..........پھر بھی تیری آنکھ نہیں کھلتی۔ہوش میں ہے تو؟"

رمیش کے جھنجھوڑنے پر لکشمی جاگی اور حیرت و استعجاب سے رمیش کو دیکھنے لگی..........
اسے سمجھ نہ آرہی تھی کہ رمیش کو کیا جواب دے!..........رمیش کے کھانا کھانے کا وقت ہو چکا تھا اور وہ فقیر کی نگاہوں سے ایسی مدہوش ہوئی تھی کہ ہر بات اس کے ذہن سے نکل گئی تھی۔لکشمی پر نقاہت غالب آتی جارہی تھی..........اور وہ بمشکل رمیش کو بتا پائی کہ "نہ جانے آج کل کیوں اس پر مدہوشی طاری ہو جاتی ہے۔بھلا پورا دن وہ گھر پر تنہا کیسے گزارے..........؟"۔فقیر والی بات اس نے رمیش کو نہ بتائی کیونکہ فقیر دوسرے دھرم کا تھا۔رمیش کو بتانے سے بات کا بتنگڑ بن جاتا..........

رمیش نے اس سے کہا کہ "وہ کھانا تیار کرے۔وہ پھر دوکان پر جارہا ہے، کیونکہ ضلع ہزارہ کا ایک قافلہ ٹھہرا ہوا ہے اور ان لوگوں نے رمیش کی دوکان سے زیورات خریدنے ہیں.........."۔پھر رمیش کچھ سوچتے ہوئے بولا.........."میں تمہاری تنہائی کا کچھ حل سوچتا ہوں..........تنہائی تم پر نفسیاتی طور پر اثرانداز ہو رہی ہے۔کچھ دنوں تک میں اپنی چھوٹی بہن شکنتلا کو سری نگر سے لے آؤں گا۔صرف پتاجی سے اجازت لینی پڑے گی"۔اتنا کہہ کر رمیش دوکان پر چلا گیا..........

لکشمی نے کھانا تیار کر لیا..........کھانا کھاتے ہوئے رمیش نے کھانے کی بہت تعریف کی کہ "آج کھانا بہت لذیذ ہے"لکشمی تو ہمیشہ کھانا پکاتی تھی، مگر فقیر کی نگاہوں کی تاثیر شاید آج کھانے میں بھی حلول کر گئی تھی۔..........کئی دن گزر گئے، لکشمی فقیر کا انتظار کرتے کرتے بے تاب ہو گئی..........وہ ہر روز صبح سویرے گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر بالکونی میں آکر بیٹھ جاتی ....شاید فقیر کا ادھر سے گزر ہو..........مگر ایسا نہ ہوا..........مسلمان فقیر اچانک کہیں غائب ہو گیا تھا۔اسے فقیر کا کچھ اتا پتا بھی معلوم نہ تھا۔اگر ہوتا بھی تو وہ دوسرے دھرم کے فقیر سے کیسے رابطہ کرتی..........لکشمی کی بیتابی اتنی بڑھ گئی کہ اس کے لیے پل پل گزارنا مشکل ہو گیا۔اسے ایسا لگا کہ اگر آج فقیر نہ آیا، تو اس کا دل دھڑکنا بند ہو جائے گا۔کلیجہ پھٹ جائے گا۔اس کے دل میں ہول اٹھتے ....بے چینی اور بے تابی کے نشتروں نے اس کا دل کرچی کرچی کر دیا تھا..........لکشمی کی بے چین نگاہیں فقیر کو تلاش کر رہی تھیں، اس نے دیکھا کہ سر پر مٹی کا برتن اٹھائے ایک بڑھیا سڑک پر چلتی آرہی ہے۔برتن کا منہ ایک سفید کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا۔بڑھیا چلتے چلتے پڑاؤ والوں کے گاڑھے گئے ایک خیمے کے پاس پہنچی، جس کا سایہ سڑک کے کنارے پر پڑ رہا تھا۔بڑھیا نے مٹی کا برتن آہستگی سے سر سے اتار کر زمین پر رکھا اور پھر خود نیچے زمین پر بیٹھ گئی۔لکشمی سوچنے لگی کہ یہ بڑھیا یہاں کیوں بیٹھ گئی ہے! کیا یہ بھی کوئی چیز قافلہ والوں کے ہاں فروخت کرنے کے لیے لائی ہے..........مٹی کے برتنوں میں مسلمان عورتیں دودھ وغیرہ ذخیرہ کرتی تھی۔کیا برتن میں دودھ ہو گا؟

بڑھیا کو وہاں بیٹھے ہوئے چند ہی لمحے گزرے تھے کہ لکشمی نے دیکھا کہ وہی فقیر سبز چغہ پہنے کسی طرف سے چلتا ہوا بڑھیا کے پاس آپہنچا۔فقیر پر نظریں پڑتے ہی لکشمی خوشی سے کھل اٹھی۔اس پر تو شادی مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی تھی..........بڑھیا فقیر کو دیکھتے ہی تیزی سے اٹھی۔مٹی کے برتن کے منہ پر لپٹا کپڑا کھولا..........اور برتن فقیر کے آگے رکھ دیا۔بڑھیا مسلسل فقیر سے کچھ کہے جا رہی تھی..........لیکن نیچے بازار کے شور کی وجہ سے بڑھیا کی آواز لکشمی تک نہ پہنچ پا رہی تھی..........
فقیر نے برتن میں جھانکا اور پھر چل دیا..........بڑھیا نے تیزی سے برتن میں ہاتھ ڈال کوئی چیز نکالی

اور نیچے پھینک دی..........اور برتن اٹھا کر دوبارہ فقیر کے پاس لے گئی..................فقیر نے مٹی کا برتن بڑھیا سے لیا اور زور کے ساتھ سڑک کی عقبی دیوار پر دے مارا............مٹی کا برتن ٹوٹا اور دیوار پر دودھ کے چھینٹے پھیل گئے..................تب لکشمی کو معلوم ہوا کہ بڑھیا فقیر کو پیش کرنے کے لیے برتن میں دودھ لائی تھی۔ برتن توڑنے کے بعد فقیر آہستہ آہستہ چلتا ہوا تجارتی قافلوں کے گاڑھے گئے خیموں کے درمیان سے گزرا اور نظروں سے اوجھل ہوگیا۔لکشمی کے دل میں فقیر کو دیکھنے سے سرشاری و شادمانی کی دھنیں بجنے لگیں............اور وہ بالکونی سے اٹھ کر اندر چلی گئی کیونکہ رمیش کے لیے کھانے پکانے کا وقت ہوگیا تھا..................کئی دن بعد لکشمی کو اپنی ایک مسلمان سہیلی ”نگینہ“ جو اس کے گھر کبھی کبھار ہی آتی تھی، کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ فقیر عشق الٰہی میں سوختہ ایک بزرگ ہیں..........جو اکثر علاقے میں گھومتے رہتے ہیں..........نگینہ نے بتایا کہ چند دن پہلے اس کے گاؤں سے گزرتے ہوئے ایک گھر میں بھینسیں بندھی دیکھ کر بزرگ نے دودھ مانگا..........گھر میں صرف ایک بڑھیا تھی ....بڑھیا نے کہا..........”سائیں جی..........دودھ نہیں ہے“۔ بزرگ ”دودھ نہیں.......... دودھ نہیں..................“ پکارتے ہوئے چلے گئے..........تو پھر دو ہی دنوں میں بڑھیا کی کئی بھینسیں اور بکریاں مر گئیں..........تیسرے دن بڑھیا دودھ کا بھرا مٹی کا کورا برتن لے کر قافلوں والوں کے خیموں کے پاس فقیر کے انتظار میں بیٹھ گئی اور رو رو کر بزرگ کو بتایا کہ اس کے سب مویشی مر گئے ہیں ....پھر دودھ بزرگ کی خدمت میں پیش کیا..................بڑھیا نے برتن کے منہ پر لپٹا ہوا کپڑا کھولا تو برتن میں ایک بڑی سی مکڑی دودھ پر بیٹھی ہوئی تھی..........بڑھیا نے ہاتھ سے مکڑی نکال کر پھینک دی تو اس پر بزرگ کو جلال آگیا اور برتن اٹھا کر دیوار پر دے مارا اور بولے ”مکڑی کے لیے ہی تو دودھ منگوایا تھا..........“ بڑھیا نے دھائی دی کہ دعا کیجیے کہ میرے مویشی نہ مریں.......... بزرگ کے استفسار پر بڑھیا نے بتایا کہ اس کی ایک بھینس اور ایک بکری ہی زندہ رہ گئی ہیں باقی سب مویشی مر چکے ہیں..........بڑھیا کی بات سن کر بزرگ نے تالی بجائی اور بولے ”ایک بھینس اور ایک بکری“ پھر یہی الفاظ دہراتے ہوئے چلے گئے..................اب لوگ کہتے ہیں کہ بڑھیا کی کئی نسلو

ں کے ہاں ایک بھینس اور ایک بکری سے زیادہ مویشی نہ ہو پائیں گے۔لکشمی نے جب نگینہ کی زبانی یہ باتیں سنیں تو تمام واقعہ اس کی نظروں میں گھوم گیا..................کیونکہ یہ سب اس کی نگاہوں کے سامنے ہوا تھا..................لیکن وہ خاموش رہی............۔

..................لکشمی پر ہر دوسرے تیسرے دن اچانک بے خودی طاری ہو جاتی، اس کے حواس معطل ہو جاتے............عشق اور عقیدت نہایت لطیف جذبات ہیں۔عشق کا متحمل ہر آدمی نہیں ہوسکتا............عشق کی چنگاری صرف ان ہی قلوب میں پھوٹتی ہے، جن کے دلوں کی کھیتی زرخیز ہو۔ جہاں کثافت نے ڈیرے نہ جمار کھے ہوں۔عشق کا جذبہ اپنے اندر لافانی ولامتناہی توانائی رکھتا ہے۔ بعض اوقات یہ توانائی اس قدر شدید ہوتی ہے کہ مادی جسم اس کا متحمل نہیں ہوسکتا............لیکن عشق کی حقیقت اور کیفیت سے صرف وہی لوگ آگاہ ہیں، جو اس میدان سے گزرے ہیں..........عرف عام میں صنفی جذبہ کو بھی عشق کا نام دیا جاتا ہے، لیکن یہ خود فریبی ہے۔عشق صنفی جذبات سے ماوراء ہے۔لیکن صنفی جذبہ کی شدت ضرور عشق حقیقی کی داغ بیل ڈالتی ہے۔عشق مجازی ہی کی گہرائی میں عشق حقیقی کا ملکوتی جذبہ مستور ہوتا ہے، لیکن اس کو وہی شناخت کرسکتا ہے جس پر یہ کیفیات وارد ہوئی ہوں۔ لکشمی کی وجہ سے رمیش کی پریشانی مسلسل بڑھتی جا رہی تھی............لکشمی کے انداز و اطوار اور انداز تکلم میں بہت تبدیلی آچکی تھی............وہ مسلمانوں کے بارے میں زیادہ جاننے کی کوشش کرتی اور کرید کرید کر سوالات پوچھتی............حالانکہ وہ بچپن سے ہی ہندو دھرم سے بہت دلچسپی رکھتی تھی............ایک مسلمان لڑکی کو اس نے اپنی دوست بنالیا تھا............لکشمی سے پوجا پاٹ بھی چھوٹ گئی تھی............اور یہ چیزیں رمیش کو پسند نہ تھیں............اور مسلسل اسے کھٹک رہی تھیں ....رمیش کو جب بھی وقت ملتا............وہ لکشمی کو سمجھاتا۔لکشمی ”ہوں، ہاں“ سے زیادہ جواب نہ دیتی............زیادہ تر خاموش رہتی............اسکی یہ مسلسل پراسرار خاموشی رمیش کے نزدیک کسی بڑے خطرے کا پیش خیمہ تھی............گزشتہ چھ ماہ سے لکشمی کا یہی حال تھا۔پھر رمیش سوچتا کہ شاید دن بھر مسلسل تنہا رہنے سے لکشمی کی طبیعت بدل گئی ہے، جس کے نفسیاتی اثرات آہستہ آہستہ ظاہر ہو

رہے ہیں..........آخراس نے فیصلہ کیا کہ وہ چند ماہ کے لیے لکشمی کوسرینگر چھوڑ آئے۔ دیورانیوں، جٹھانیوں اورنندوں کی معیت میں رہ کراس کی طبیعت سنبھل جائے گی..........اور پھر وہ اسے دوبارہ مظفرآباد لے آئے گا.......... چنانچہ اس نے سرینگر جانے کی تمام تیاری مکمل کرلی تھی۔ دوسرے دن دونوں نے صبح سویرے سرینگر کے لیے رخت سفر باندھنا تھا..........لیکن صبح چاشت کے وقت ہی لکشمی دھاڑی مار مار کررونے لگی..........اور پھر روتے روتے بے ہوش ہوگئی تھی.......... ہر ہر پل رمیش پر بھاری ہوتا جارہا تھا..........اس نے سرینگر جانے والے ایک قافلے

کے ہاتھوں اپنے پتا جی کے لیے اپنی اور لکشمی کی آمد کا پیغام بھی بھیج دیا تھا اور کہلا بھیجا تھا کہ لکشمی کی بیماری کے لیے کسی سادھو یا پنڈت سے رابطہ کریں تا کہ لکشمی کا علاج کروایا جاسکے۔ لیکن لکشمی کی حالت اچانک ہی بگڑ گئی تھی۔

اڑوس پڑوس کے ہندوگھرانوں کی چند عورتیں، رمیش کی خالہ بے ہوش لکشمی کے پلنگ کے پاس پریشان بیٹھی ہوئی تھیں۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آرہا تھا کہ آخر لکشمی کو ہو کیا گیا ہے۔ سکھ حکیم جو بازار میں بیٹھتا تھا، تین بار لکشمی کو دیکھ چکا تھا..........اس نے دوبارہ ہوش میں لانے والی دوائیں دی تھیں مگر لکشمی پر مطلق اثر نہ ہوتا تھا.......... یہاں مظفرآباد میں ایسا کوئی مستند ڈاکٹر بھی نہ تھا کہ لکشمی کو جس کے پاس لے جایا جاتا۔ رمیش تھا بھی اس شہر میں نووارد۔ یہ سب کچھ سوچ کر اس کی پریشانی میں مزید اضافہ ہوجاتا..........عصر کے وقت مسلمانوں کی مسجد سے ''اللہ اکبر'' کی صدا بلند ہوئی تو لکشمی اچانک اٹھ بیٹھی..........اس نے حیران و پریشان نظروں سے سب کی طرف دیکھا اور پھر ہنس دی..........

رمیش نے آگے بڑھ کر لکشمی کو پیار سے پکارا.............. ''لکشمی..........لکشمی''، لیکن لکشمی کچھ نہ بولی..........پھر وہ مسلمانوں کی مسجد سے پکاری جانے والی اذان کے الفاظ دھرانے لگی۔

سب حیران و ششدر لکشمی کو دیکھ رہے تھے، لکشمی اذان کے الفاظ دھرا رہی تھی..........

اس کی آنکھوں سے جلال ٹپک رہا تھا۔ لکشمی نے آخری الفاظ زوردار لہجے میں دوبار دھرائے۔

اللہ اکبر..........اللہ اکبر..........لا الہ الا اللہ۔ پھر لکشمی کو ایک شدید جھٹکا لگا تھا اور

پلنگ پر ہی دم توڑ گئی۔

سبز چغے والے بزرگ کی رہائش گاہ ایک برساتی نالے کے قریب تھی۔ بزرگ کی رہائش کے لیے لوگوں نے ایک چھپر ڈال دیا تھا۔ بزرگ گزشتہ کئی دنوں سے بیمار تھے۔ جن کو دیکھنے اور تیمارداری کے لیے آنے والے لوگوں کا تانا بانا بندھا رہتا..........لوگ گروہوں اور ٹولیوں کی شکل میں فقیر کی صحت یابی کے لیے دعائیں مانگنے آتے اور پھر فقیر سے اپنے لیے دعا مانگنے کا اصرار کرتے۔ ایک دن بزرگ داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ بزرگ کی رحلت سے لوگ صدمے سے نڈھال ہوگئے اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ اہل علاقہ کے معززین کی رائے اور مشاورت سے بزرگ کو برساتی نالہ کے قریب ایک ہموار میدان میں سپرد خاک کردیا گیا۔ جس وقت لوگ مظفرآباد میں بزرگ کی قبر پر ہاتھوں سے مٹی ڈال رہے تھے، عین اسی وقت سرینگر میں لکشمی کی چتا جل کر راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہوچکی تھی۔ جس میں ہلکی ہلکی چنگاریاں ابھی تک سلگ رہی تھیں۔



گاؤں کا اسسٹنٹ ڈائریکٹر

ہمارے معاشرے میں بالادست واجارہ دار
کی آہنی گرفت کے مضمرات اور تاریخی
پس منظر میں لکھا گیا ایک افسانہ۔

مالھو کے مکان کی چھت پر بان کی چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ جہاں گاؤں کے بہت سے دیہاتی اور کسان نمبردار کی معیت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ نعمانہ، گل احمد، کالو ترکھان، پھاباں لوہار، حجام کھشو آج سب لوگ یہاں ہی جمع تھے.........نمبردار یہاں ایک جرگہ میں جھگڑا نمٹانے آئے تھے۔

نمبردار کی چارپائی کے سامنے ایک پرانے بوسیدہ لکڑی کے ٹیبل پر جگ گلاس کے ساتھ چائے کی کیتلی اور مٹی کے چند بڑے پیالے رکھے ہوئے تھے۔ ابھی صبح کا وقت تھا۔ سورج چند ہی ہاتھ اوپر چڑھا تھا۔ مگر پھر بھی زیادہ لوگوں کی پیشانیاں عرق آلودہ ہوگئیں تھیں۔ دھوپ کی تمازت بڑھتی جارہی تھی۔ محفل میں نمبردار کی باتوں کی پاٹ دار اور بنگ آواز گونج رہی تھی.........جس کے جواب میں سب لوگوں کی تائیدی وشکستہ آوازیں ''سچی گل ہے، بہت خوب، کیا کھری بات کہی ہے، نمبردار ہمارے سر کی چھتری'' ساعت سے ٹکرارہی تھیں۔ اس محفل میں چارپائیوں کے بیچوں بیچ ایک نیم حواس باختہ سفید ریش بوڑھا آدمی گھٹنوں کے بل خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ جس کے سر کے بال اور ڈاڑھی تنکوں وگرد وغبار سے اٹی ہوئی تھی۔ آنکھیں نیم وا، قمیض پھٹی ہوئی، میلی کچیلی اور گریبان وآستینوں کے بٹن ندارد۔ اس کے پاؤں اور ہاتھوں پر میل کے تہیں جمی ہوئی تھیں۔ جو پسینے میں گھل کر اس کے جسم پر پھیل کر بہہ رہی تھی.........یہ شخص بالکل گم صم گھٹنوں میں اپنی ٹھوڑی پھنسائے بیٹھا ہوا تھا، جس کی زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا تھا.........آخرکار نمبردار نے اس شخص کو گھورتے ہوئے پوچھا ''آج اسسٹنٹ ڈائریکٹر بالکل خاموش ہیں کیا؟''

نمبردار کے استفسار پر گل احمد اپنی ڈھیلی پگڑی کھول کر دوبارہ سر پر باندھتے ہوئے بولا ''آج ڈائریکٹر صاحب خاموش ہیں، حکم ہو تو ان کو بلاؤں؟''

''ہاں ذرا بلاؤ'' نمبردار نے رضامندی کا اظہار کردیا۔

نمبردار کی رضامندی پا کر گل احمد زور سے بولا۔

''گاؤں کا اسسٹنٹ ڈائریکٹر میں ہوں''

''اسسٹنٹ ڈائریکٹر'' کی آواز سنتے ہی نیم حواس آدمی یکلخت اچھل کر کھڑا ہوا اور پوری قوت سے گلا پھاڑ کر غصہ سے بولا ''نہیں......گاؤں کا اسسٹنٹ ڈائریکٹر میں ہوں............میں ہوں......میں ہوں'' اور پھر آناً فاناً دوبارہ گھٹنوں کے بل مٹی کی دھول میں بیٹھ کر چپ سادھ لی۔ نیم حواس شخص کے اس طرح پکارنے پر محفل میں قہقہے گونجنے لگے۔ نمبردار کے لبوں پر بھی ایک زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی اور اس کے ساتھ ہی نمبردار نے جرگہ برخواست کردیا۔

یہ حواس باختہ شخص ایک وقت میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر محکمہ تعلیم تھے، جن کا نام سردار اعجاز تھا۔ جو کسی زمانے میں ان کی شخصیت پر پوری طرح جچتا تھا۔ ان کی سرشت میں مہم جوئی، رسک لینے اور خطرات سے ٹکرانے کا عنصر بہت قوی تھا۔ بچپن سے ہی انہیں علم سے لگاؤ تھا اور وہ اچھے خاصے پڑھ لکھ بھی گئے تھے۔ انہوں نے اس وقت میٹرک پاس کیا تھا جب کوسوں دور دور تک میٹرک تو کیا مڈل پاس بھی بہت کم لوگ ملتے تھے۔ وہ ایک دور افتادہ پہاڑیوں میں گھرے ہوئے گاؤں میں رہتے تھے۔ انہوں نے بڑی ہمت اور استقامت سے میٹرک تک تعلیم حاصل کی تھی۔ اپنی طالبعلمی کے دوران انہوں نے ان گنت سختیاں، مصائب اور دکھ جھیلے تھے۔ کئی کئی میل برہنہ پا، پیدل حصول تعلیم کے لیے سکول میں جانا پڑتا تھا۔ لیکن ان کے عزم واستقلال نے ان سب مشکلات ومصائب کو مات دے دی تھی۔ ان کی شرافت، سادگی اور آہنی عزم کی وجہ سے گاؤں کے لوگوں کو ان سے عقیدت سی ہوگئی تھی.........لوگ کھیتوں، کھلیانوں میں، چاندنی راتوں کی محفلوں میں، فصل کٹوائی و بوائی کے موقعوں پر فخریہ باتیں کرکے ایک دوسرے پر اپنی اہمیت جتاتے کہ ہمارے گاؤں کے فلاں لڑکے نے میٹرک پاس کرلی ہے۔ یہ لڑکا ہمارے لیے باعث فخر وعزت ہے۔ وہ گاؤں کے سب دیہاتیوں کی آنکھوں کا تارا تھے.........لیکن کچھ بڑے بوڑھوں کی رائے کے مطابق ان کا میٹرک تک پہنچ جانا نیک شگون نہیں تھا.........ان

بوڑھوں کے نزدیک ان کی تعلیم خود ان کے لیے اور گاؤں والوں کے لیے بڑی تباہی کا پیش خیمہ بھی بن سکتی تھی...........مگر بڑے بوڑھوں کی باتیں چٹے ان پڑھ دیہاتی ہنسی مذاق میں ٹال دیتے تھے اور کسی کو بڑے بوڑھوں کی منطق سمجھ میں نہیں آتی تھی...........پھر ایک دن سردار اعجاز گاؤں والوں کو خیر آباد کہہ کر شہر میں چلے گئے۔وہ محکمہ تعلیم میں ملازم ہو گئے تھے۔گاؤں کے لڑکے بالے بہت سٹپٹائے۔ان کے ہم عمر دوستوں کو بہت دکھ ہوا کہ ان کا سرمایہ ان سے چھن رہا ہے،لیکن سردار اعجاز نے انہیں سمجھایا کہ وہ گاؤں سے عارضی طور پر جا رہے ہیں۔ابھی نیا نیا پاکستان بنا ہے۔ تعلیم یافتہ لوگ بہت کم ہیں۔وہ ملک وملت کی خدمت کرنا چاہتے ہیں اور پاکستان کی نئی بننے والی حکومت کو ان جیسے پڑھے لکھے لوگوں کی اشد ضرورت ہے۔اس لیے وہ ضرور شہر جائیں گے۔

گاؤں کے لوگوں نے انہیں تحفے تحائف دے کر رخصت کیا اور یوں سردار اعجاز اپنا گاؤں چھوڑ کر شہر کی پرہجوم زندگی میں آ گئے۔ان کی تقرری محکمہ تعلیم میں ٹیچر کی آسامی پر ہوئی تھی۔ایک ٹیسٹ میں اعلیٰ نمبر لینے پر انہیں شہر کے ایک ہائی سکول میں تعینات کر دیا گیا۔جہاں وہ پورے پانچ سال پوری توجہ سے قوم کے نونہالوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرتے رہے۔ان پانچ برسوں کے دوران وہ ہر سال موسم گرما کی تعطیلات گاؤں میں گزارتے۔ایک برس موسم گرما کی تعطیلات کے دوران ہی انہیں ان کی پھوپھی زاد ''کرشمہ'' کے ساتھ رشتہ ازدواج میں باندھ دیا گیا۔جسے اماں کی اجازت ملنے پر وہ اپنے ساتھ شہر لے آئے۔

محکمہ تعلیم کو تعلیم یافتہ افراد کی عدم دستیابی اور فنڈز کی شدید قلت کے باعث نئے سکولز قائم کرنے میں شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ملک کی تقریباً ساری ہی آبادی نیم خواندہ یا ناخواندہ تھی۔ہر ہر گاؤں میں تعلیمی ادارے قائم کرنے کی ضرورت تھی،مگر یہ کام عجلت میں کرنا ناممکن تھا۔ان گنت مشکلات تھیں۔محکمہ تعلیم کے اعلیٰ آفیسران کوئی دور رس پالیسی مرتب نہ کر پا رہے تھے۔محکمہ تعلیم کو درپیش ان مشکلات کا تذکرہ اکثر سکولوں کے اساتذہ کرام کے ہاں بھی ہوتا رہتا تھا۔سردار اعجاز تو ان مباحثوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے اور تعلیم عام کرنے کے لیے طرح طرح کے مشورے اور تجاویز دیتے...........ایک دن سکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ اپنی تجاویز لکھ کر وزارت تعلیم کو بھیج دیں کیونکہ ان کی تجاویز واقعی معقول اور مناسب تھیں۔ چنانچہ سردار اعجاز نے اپنی تجاویز بقلم خود خوش خط لکھ کر وزارت تعلیم

والوں کو بھیج دیں...........کوئی مہینہ بھر بعد وزارت تعلیم کی طرف سے انہیں ایک خط موصول ہوا۔ وزیر تعلیم نے انہیں طلب فرمایا تھا...........یقیناً ان کی تجاویز قابل عمل اور قابل پذیرائی ہی تھیں۔

وزیر تعلیم ان کی تجاویز سے بہت متاثر ہوئے تھے۔وہ کافی وقت ان سے باتیں کرتے رہے...........پھر انہیں رخصت کرتے ہوئے ایک گورنمنٹ نوٹیفکیشن دیا۔ان کی معقول اور قابل عمل تجاویز کے صلے میں وزیر تعلیم نے انہیں محکمہ تعلیم کا اسسٹنٹ ڈائریکٹر تعینات کروا دیا تھا۔ سردار اعجاز نے اپنی اس عزت افزائی اور پذیرائی پر وزیر تعلیم کا شکریہ ادا کیا...........اب ان کی ذمہ داری تھی کہ وہ ایک ڈویژن میں اپنی نگرانی میں پرائمری سطح کے نئے تعلیمی ادارے قائم کروائیں۔یہی ٹارگٹ انہیں وزیر تعلیم نے دیا تھا۔سردار اعجاز اس عنایت پر کھل اٹھے۔ان کے مقدر ان کا ساتھ دے رہے تھے۔یہ تو ان کے لڑکپن کی آرزو تھی کہ گاؤں گاؤں کم از کم پرائمری ایجوکیشن کے ادارے قائم ہوں...........وہ اپنی نئی جائے تعیناتی پر چارج لینے کے بعد پوری مستعدی سے اس سرکاری ڈیوٹی اور منصوبہ پر عملدرآمد کے لیے جت گئے...........

انہوں نے اس نئے تعلیمی پروگرام کو ''تعلیم عام'' کا نام دیا اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے دن رات ایک کر دیئے۔خود اپنے سٹاف کے ہمراہ دیہاتوں کے ہنگامی دورے کیے۔ دیہاتیوں سے بے شمار میٹنگیں کیں۔انہیں تعلیم کی قدر و منزلت سے آگاہ کیا اور تقریباً ساٹھ فیصد مقامی وسائل سے چند ہی برسوں میں کئی درجن پرائمری سکول قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ان کی پانچ سالہ کارکردگی پر انہیں تعریفی اسناد سے نوازا گیا۔خود وزیر تعلیم نے ان کی صلاحیتوں اور کوششوں کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں یقین دلایا کہ انہیں بہت جلد بالا سکیل میں ترقیاب کیا جائے گا اور دیگر پسماندہ علاقوں کے لیے ان کی خدمات حاصل کی جائیں گی...........

ایک دن وہ اپنے دفتر میں بہت خوش بیٹھے ہوئے تھے اور اپنے ذہن میں پروگرام ''تعلیم عام'' کے لیے مختلف منصوبے بنا رہے تھے کہ ان کے دفتر کے ایک کلرک نے ایک فائل لا کر ان کے سامنے رکھ دی۔یہ فائل پڑھتے ہی ان کے اوسان خطا ہو گئے...........بمعہ ثبوت ان پر کرپشن کے سنگین الزامات لگائے گئے تھے اور ان کے خلاف اس علاقے کے کئی افراد نے تحریری اور حلفیہ شکائتیں وزارت تعلیم میں درج کروائی تھیں جہاں انہوں نے کچھ عرصہ پہلے پرائمری سکول قائم کروائے تھے۔ان لوگوں نے اپنے حلف ناموں میں لکھا تھا کہ

انہوں نے ہزاروں روپے مقامی متمول افراد سے ''تعلیم عام'' پروگرام کے لیے ہیں، جس کے گواہ اور رسیدیں بطور ثبوت حلف ناموں کے ساتھ شامل کی گئی تھیں۔ان لوگوں کا کہنا تھا کہ یہ رقم سردار اعجاز نے سکول تعمیر کرنے پر خرچ نہیں کی بلکہ خرد برد کر لی ہے۔ان افراد نے کمال مہارت سے سکولوں کے قائم کیے جانے کے اخراجات کا مجموعی تخمینہ بھی شامل کیا تھا۔ان ثبوتوں کی روشنی میں سردار اعجاز پوری طرح بغیر کسی شک وشبہ کے مجرم ٹھہرتے تھے۔حالانکہ انہوں نے کسی سے اک پائی بھی نقد رقم نہیں لی تھی بلکہ اپنے دوروں کے دوران کسی کے ہاں کھانا تک نہیں کھایا تھا۔ہاں چند دیہاتی لوگوں سے سکولوں کی عمارت وغیرہ جو گاؤں کے کسی مکین سے عارضی طور پر بطور عطیہ لی جاتی تھی، کی مرمتی جیسے کام ضرور بلا اجرت کروائے تھے اور یہ کام ان لوگوں نے شوق ولگن کے ساتھ بطور تعاون اپنی طرف سے کیے تھے۔

............بے چارے سردار اعجاز کی قسمت اس سے شاید اچانک روٹھ گئی تھی۔ان کی انکوائریاں شروع ہوئیں جو ایک برس تک چلتی رہیں............اور............اور............آخر کار وہ ہزار جتنوں کے باوجود اپنے آپ کو بے گناہ ثابت نہ کر سکے............وہی وزیر تعلیم جو ان کی دل سے قدر کرتے تھے ان پر نامہربان ہو گئے اور انہیں ملازمت سے فارغ کرنے کی ٹھان لی............تاہم سیکرٹری تعلیم کی سفارش پر انہیں ملازمت سے فارغ تو نہ کیا گیا، لیکن بطور سزا ان کی بالاسکیل میں ترقیابی پر دائمی پابندی لگا دی............اور یہ سیکرٹری تعلیم کا کاوشوں سے ہوا تھا کہ ان کی ملازمت بچ گئی............سیکرٹری تعلیم ایک جہاں دیدہ اور عمیق فکر رکھنے والے آدمی تھے............انہیں یقین تھا کہ محکمہ تعلیم کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر بے گناہ ہیں، لیکن ان جھوٹے، فرضی اور جعلی لیکن ٹھوس ثبوتوں نے وزیر تعلیم کو سردار اعجاز سے بدظن کر دیا تھا............وہ تو شکر تھا کہ سیکرٹری تعلیم کی کوششوں سے سردار اعجاز وزیر تعلیم کے عتاب سے بچ گئے ورنہ ملازمت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے..................

ایک دن سیکرٹری تعلیم نے سردار اعجاز کو فون کر کے اپنے دفتر بلایا تو ان کا رنگ پھر ہلدی ہو گیا۔ان کا ماتھا ٹھنکا کہ یقیناً کوئی نئی افتاد پڑنے والی ہے۔وہ ڈرے سہمے سیکرٹری تعلیم کے دفتر گئے لیکن سیکرٹری صاحب کے مشفقانہ انداز تکلم نے ان کی ڈھارس بندھوائی۔سیکرٹری صاحب نے انہیں اپنے پاس بٹھا کر پوچھا۔

''آپ کیا سمجھتے ہیں کہ آپ پر لگائے گئے الزامات درست ہیں؟''

''نہیں سر! بالکل جھوٹ............مکمل جھوٹ''

''تو پھر آپ اپنے آپ کو سچا ثابت کیوں نہ کر سکے؟''

''سر......سر......ان لوگوں کی بیان حلفیاں بالکل جھوٹی تھیں۔میں نے کسی سے کوئی پیسہ یا نقد رقم نہیں لی''۔

سیکرٹری صاحب بولے............''مانا کہ ان کی بیان حلفیاں بالکل جھوٹی ہوں گی، لیکن انہوں نے اپنا جھوٹ سچ ثابت کر دیا ہے اور اب آپ کچھ بھی نہیں کر سکتے''۔

''......سر......سر میں کروں بھی کیا............کوئی درجن بھر لوگ یک زبان ہو کر مجھ پر الزام لگا رہے ہیں............کس کس کا منہ کس کس طریقہ سے بند کرتا''۔

سردار اعجاز صاحب روہانسے ہو گئے۔

سیکرٹری تعلیم نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔

''سنو............جب انسان کے اندر کثافت بھر جائے تو وہ کچھ بھی کر سکتا ہے اور جب کوئی فرد دوسروں کی حق تلفی کرتا ہے تو اس کے باطن سے فکر سلیم کے تمام نشانات مٹ جاتے ہیں............ہمارے معاشرے کا بالادست طبقہ نہایت چالاک، ہوشیار، سفاک اور ظالم ہے''۔

''جی! بالکل'' سردار اعجاز غمناک لہجہ میں بولے۔

''سنو'' سیکرٹری صاحب نے انہیں ہاتھ ہلا کر خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''جاگیردار، وڈیرا اور گاؤں کا نمبردار ہمارے معاشرے کا مطلق العنان حاکم ہے۔صدیوں سے اس کی گرفت توڑی نہیں جا سکی۔اس طبقہ کی ناراضگی مول لے کر کوئی شخص کامیاب نہیں ہو سکتا۔

آپ نے جس ڈویژن میں درجنوں سکول قائم کروائے ہیں، وہاں کا نمبردار اور وڈیرہ یہ قطعی برداشت نہیں کرتا کہ عام لوگ پڑھ لکھ جائیں۔یہ علم کی روشنی، جرات، ہمت اور استقامت پیدا کرتی ہے۔افراد کو اپنے حقوق کا علم ہوتا ہے اور وہ حقوق کے حصول کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور اس ہی چیز سے ہمارا نمبردار، جاگیردار، نواب اور وڈیرہ خوف زدہ ہے............کہنے کو تو پاکستان بن گیا ہے، لیکن یاد رکھنا! ہمارے معاشرے کا یہ ناسور ملک کا سفینہ ڈبو دے گا۔لہٰذا آپ سے کوتاہی یہ ہوئی کہ آپ نے علاقہ میں نمبردار اور وڈیرہ کی مرضی کے

خلاف ''تعلیم عام'' پروگرام شروع کر دیا۔ اس پروگرام کے ثمرات نے ایک دن نواب اور نمبر دار کی اتھارٹی کو چیلنج کرنا تھا۔ چنانچہ نمبر دار اور جاگیر دار نے ایک سازش کا جال تیار کر کے آپ کو اس میں پھانس لیا۔ ایک دوراندیش اور ذمہ دار سرکاری افسر کی حیثیت سے آپ کو تمام پہلوؤں پر نظر رکھنی چاہیے تھی............ یاد رکھنا پوری قوم کی ایک یونٹ ایک اکائی کی حیثیت سے اجتماعی جدوجہد ہی اس معاشرتی اجارہ دار سے قوم کو نجات دلا سکتی ہے............ اس کے علاوہ دوسری کوئی صورت اور حربہ نہیں ہے۔ یہ اجارہ دار طبقہ عقل عام سے عوام کو محروم رکھنا چاہتا ہے............ یہ چاہتا ہے کہ عقل اور فکر پر بھی اس کی اجارہ داری قائم رہے............ یہ بالا دست اور اجارہ دار طبقہ عوام کو صرف ٹکڑوں پر زندہ رکھنا چاہتا ہے، تاکہ عام آدمی کا ذہن بھوک اور روٹی کے چکر سے آزاد نہ ہو سکے............ اس مظلوم اور بے نوا طبقہ کی بیداری بالا دست طبقہ کے لیے موت ہے

.... موت............ دیکھنا پاکستان قائم ہو گیا ہے۔ ابھی کوئی عشرہ بھر ہی گزرا ہے، لیکن ذہن نشین کر لینا جب تک اجارہ دار طبقہ کی اتھارٹی قائم رہے گی پاکستان کے عام آدمی کے حالات صدیاں گزرنے کے باوجود یوں ہی رہیں گے اور عام آدمی روٹی کے ایک ایک نوالے کے لیے ترستا رہے گا۔ سینکڑوں طرح کے عوامی فلاح کے پروگرام شروع ہوں گے اور اپنی موت آپ مر جائیں گے۔ ان کی حیثیت نمائشی اور ایک سہانے خواب سے زیادہ کچھ نہ ہو گی............ بالا دست اور اجارہ دار طبقہ بھوکے ننگے پسے ہوئے لوگوں کو روٹی کے لیے چند ٹکے دے کر فلاح و بہبود کا ڈھنڈورا پیٹتا رہے گا............ صدیاں بیت جائیں گی، لیکن عوام کو کبھی اپنے قدموں پر کھڑا ہو کر قوم و ملک کو کچھ دینے والا نہیں بننے دیا جائے گا''۔

سیکرٹری صاحب کی باتوں میں حقائق تھے، صداقت تھی............ ان کی گفتگو سے عوامی ہمدردی او ردرد جھلک رہا تھا۔ اسسٹنٹ ڈائریکٹر محکمہ تعلیم سردار اعجاز گم صم سے سیکرٹری صاحب کی باتیں سنتے رہے اور پھر دل میں ایک گہرا اضطراب لیے ان سے رخصت ہوئے۔ ان کے تمام ولولوں اور جذبوں پر پانی پھر گیا تھا۔ قومی خدمت کی ساری امنگیں دم توڑ چکی تھیں............ اس دن کے بعد انہوں نے محکمہ کے اندر ایک ناکارہ پرزے کی حیثیت سے 35 برس گزار دیئے۔

وہ تقریباً چند ماہ کم چالیس سال بعد جب ریٹائر ہوئے تو ان کے سر کے سارے بال سفید ہو چکے تھے۔ گاؤں کا بانکا سردار اعجاز ہمت ہار بیٹھا تھا۔ مگر اس

کے دل میں قومی خدمت کے فتور کی چند چنگاریاں ابھی باقی تھیں۔ چنانچہ اس نے ان چنگاریوں سے اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد پھر الاؤ بھڑکانے کا ارادہ کر لیا............ اولاد کی نعمت سے وہ محروم تھے۔ انہوں نے اپنا شہر کا مکان فروخت کیا اور اپنی اہلیہ کے ہمراہ گاؤں میں سکونت پذیر ہو گئے............ گاؤں میں جا کر انہوں نے جب حالات کا جائزہ لیا تو انہیں سیکرٹری صاحب کی پیشن گوئی حرف بحرف سچ ثابت ہوتی نظر آئی۔ ان چالیس برسوں میں گاؤں کی اس پرانی زندگی کی نہج میں عملی ارتقاء کی کوئی قابل تذکرہ رمق پیدا نہیں ہوئی تھی۔ ان کے گاؤں کے لوگ ابھی تک علم کی روشنی سے محروم تھے۔ جبکہ پاکستان قائم ہوئے تقریباً نصف صدی بیت چکی تھی۔

تقریباً چالیس اکتالیس برس بعد ان کی اچانک گاؤں آمد سے گویا ایک بھونچال برپا ہو گیا۔ لڑکوں بالوں نے ان کا گھریلو سامان خود کندھوں پر اٹھا لیا اور ان کے آبائی گھر میں لے گئے............ گھر گھر ان کی آمد کے تذکرے ہونے لگے کہ ''کریم داد مرحوم کا بیٹا اکتالیس برس بعد گاؤں واپس آ گیا ہے''............ بہت دنوں تک ان کی ضیافتیں ہوتی رہیں۔ گاؤں کے سب لوگ ان کی آمد پر خوش تھے۔ ان میں ابھی تک وہی خلوص اور چاہت کی جھلک تھی، جو اکتالیس بیالیس برس پیشتر ان میں موجود تھی۔

گاؤں کے لوگوں کے والہانہ استقبال، انس و خلوص اور ہمدردی نے انہیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا............ اب گاؤں میں گھر گھر ریڈیو تھا اور ہر چوتھے پانچویں گھر میں ٹیلی ویژن۔ یہ بہت بڑی اور واحد تبدیلی تھی جو انہوں نے گاؤں میں نوٹ کی۔ ان کے نزدیک ان کا گاؤں دوسرے علاقوں سے مختلف تھا۔ لوگ محبت و ہمدردی میں پروئے ہوئے تھے............ وہ اس ہی جذبے کو استعمال میں لا کر ان میں اجتماعیت اور علم کی روشنی پھیلا سکتے تھے۔ ان کے تجزیہ کے مطابق ان کے گاؤں میں ایسی اجارہ دار اتھارٹی نہ تھی جو تعلیم کی روشنی پھیلانے میں حائل ہوتی۔ گاؤں کا نمبر دار انہیں ایک بھلا مانس آدمی لگا۔ جس کے آباؤ اجداد پشتوں سے اس گاؤں کے باسی تھے، لیکن انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ اجارہ دار ہمیشہ ایک جیسی خصلت رکھتا ہے۔ بھلے وہ کتنا ہی شریف اور بھلے مانس کیوں نہ ہو۔ انہیں یہ ادراک نہ ہو سکا کہ آج کا اجارہ دار و بالا دست برائے نام ارتقاء کے باوجود کل کا بھی اجارہ دار ہے............ حقیقت یہ ہے کہ اجارہ دار، نمبر دار، نواب، وڈیرے اور جاگیر دار و سرمایہ دار نے وقت کے دھارے کے دوش

بدوش اپنی اتھارٹی کو دوام بخشنے کے لیے اپنا استبدادی پنجہ بھی دراز کرلیا ہے............ یہ اجارہ دار ارتقاء کے ہر موڑ پر محروم و بے نوا طبقہ کے راستہ میں مختلف روپ دھار کر، لٹھ لے کر بیٹھ جاتا ہے اور اگر بے نوا آگے بڑھنے کی کوشش کرے تو اس کے لٹھ کی ضربوں سے نڈھال ہو کر گر پڑتا ہے............ پوری دنیا میں یہی ہو رہا ہے۔ استعماری قوتیں ہر دور میں نئے بہروپ بھر کر بے نوا طبقہ اور پسماندہ اقوام کے آگے آ کھڑی ہوتی ہیں۔ گاؤں کی سطح پر اور ملکوں کی سطح پر یہ دوڑ اور مسافت بہت طویل ہے، جس کا سلسلہ صدیوں سے بھی زیادہ دراز ہے............ بہت سوچ و بچار اور تجزیے کے بعد ریٹائرڈ اسسٹنٹ ڈائریکٹر صاحب نے اپنے گاؤں میں اصلاحی و فلاحی پروگرام کا آغاز کر دیا۔ یہاں وہ سرکاری ادارے کی طرح کسی ڈسپلن اور ضابطہ کے پابند نہ تھے اور دوسرا کون سی ایسی سروس یا جاب تھی جس کے چھن جانے کا انہیں اندیشہ ہوتا۔ انہوں نے گاؤں میں آ کر سکول کھولا، کچھ تعمیراتی کام کروائے، مسائل کا جائزہ لے کر انہیں حل کرنے کی کوشش کی تو یہاں بھی نمبردار کی صدیوں پرانی اتھارٹی چیلنج ہو گئی............ پھر پے در پے اسسٹنٹ ڈائریکٹر ان گنت مسئلوں اور الجھنوں میں پھنسا دیئے گئے کہ ان کا گاؤں میں رہنا ناممکن ہو گیا۔ جب وہ نئے نئے ریٹائرمنٹ کے بعد گاؤں میں آئے تھے تو انہوں نے گاؤں کے سب لوگوں کو اپنے ہاں ایک ضیافت میں جمع کر کے پر جوش خطاب کیا تھا۔ ان کے سوئے ہوئے جذبات کو الفاظ کے جادو سے جگایا۔ لوگ عش عش کر اٹھے اور تالیاں بجا کر انہیں داد دی۔ ہر حال میں ان کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔ اسی دن شام کو نمبردار کے مخبر نے اسسٹنٹ ڈائریکٹر اعجاز احمد کے ہاں ضیافت کی پوری روئیداد بیان کی تو بوڑھے نمبردار نے لمبا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا:

''وہ محکمہ تعلیم کا اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھا، اسے جلد ہی معلوم ہو جائے گا کہ گاؤں کا اسسٹنٹ ڈائریکٹر کون ہے''۔

ریٹائرڈ اسسٹنٹ ڈائریکٹر نے دن رات کی کوششوں سے اہل گاؤں کے لیے سکول تو قائم کر لیا............ مگر ایک برس بھی ابھی پورا نہ ہوا تھا کہ اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے خلاف سکول کی زمین کا مقدمہ بنا دیا گیا۔ جب سکول کی اراضی کے کاغذات حاصل کیے گئے تو انکشاف ہوا کہ نمبردار نے جعل سازی سے سکول والی اراضی کا اپنے نام انتقال کروا لیا ہے۔ بھولے بھالے اسسٹنٹ ڈائریکٹر نے جب پٹواری سے باز پرس کی تو پٹواری بپھر گیا اور مطالبہ

کیا کہ آپ دو لاکھ روپے دیں تو ان کاغذات میں تصحیح ہو سکتی ہے۔ ورنہ کوئی صورت نہیں۔ اتنی بڑی رقم کا مطالبہ سن کر تو اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ انہوں نے پٹواری کو دیانت داری اور ایمانداری پر پورا لیکچر دے دیا، مگر پٹواری نے انہیں کہا کہ ایسے لیکچر سکول کے بچوں کو دینا۔ میں اپنا برا بھلا خوب سمجھتا ہوں............ چند ہی دن گزرے تھے کہ نمبردار کی طرف سے ان پر نمبردار کی اراضی پر قبضہ کرنے اور ناجائز و غیر قانونی طور پر سکول قائم کرنے کی پاداش میں ایف آئی آر درج کروا دی گئی............ تقریباً نو دس ماہ کی جان لیوا پریشانی کے بعد جب ایف آئی آر والا معاملہ کچھ ٹھنڈا ہوا تو اس وقت تک اسسٹنٹ ڈائریکٹر صاحب کا ڈیڑھ لاکھ روپیہ خرچ ہو چکا تھا اور سکول کی عمارت میں نمبردار نے اپنے مویشی باندھنا شروع کر دیئے تھے............ ایک دن شام کو نمبردار نے انہیں فون پر ہمدردی جتاتے ہوئے پیش کش کی کہ سکول کی عمارت جو اس کی ملکیتی اراضی پر بنائی گئی ہے، ایک لاکھ روپے کے عوض اسے فروخت کر دی جائے تو وہ راضی نامہ کر کے ان کے خلاف قائم مقدمات ختم کروا دے گا۔ اسسٹنٹ ڈائریکٹر صاحب کے اوسان خطا ہو گئے۔ جس عمارت پر ان کے بارہ تیرہ لاکھ کے لگ بھگ اخراجات ہوئے تھے اور جس کی تعمیر میں گاؤں کے درجنوں رضا کاروں کی محنت شامل تھی، یہ عمارت نمبردار ایک لاکھ روپے کے عوض خرید رہا تھا............ اس صورت حال پر بڑے بوڑھوں نے انہیں مشورہ دیا کہ ایک لاکھ روپیہ نمبردار سے لے کر راضی نامہ کر لیا جائے اور سکول کے خواب دیکھنا چھوڑ دیئے جائیں............ مگر ریٹائرڈ اسسٹنٹ ڈائریکٹر راضی نہ ہوئے۔ انہوں نے آخری دم تک نمبردار سے لڑنے کا تہیہ کر لیا۔ چند ہی برس گزرے تھے کہ ماہ رمضان سے دو دن قبل نمبردار کے آدمیوں نے اسسٹنٹ ڈائریکٹر صاحب کی زمین سے درختوں کی کٹائی شروع کر دی............ معلومات لینے پر انکشاف ہوا کہ اسسٹنٹ ڈائریکٹر کا مکان خالصہ سرکار میں واقع ہے، جس پر وہ ناجائز قابض ہیں............ اس نئے انکشاف سے اسسٹنٹ ڈائریکٹر صاحب غصہ سے آگ بگولا ہو گئے۔ وہ سیدھے نمبردار اور پٹواری کے خلاف ایف آئی آر درج کروانے تھانے جا پہنچے کہ ان کی وراثتی جائیداد اور زمین جو نسل در نسل انہیں منتقل ہوئی ہے، نمبردار اور پٹواری نے جعل سازی سے ''خالصہ سرکار'' بنا دی ہے۔ لہٰذا دونوں کے خلاف ایف آئی آر درج کی جائے............ تھانیدار نے انہیں بٹھایا اور ہمدردانہ مشورہ دیا کہ گاؤں کے پٹواری کو کبھی ناراض نہ کیا

جائے۔وہ سب سے طاقتور ہوتا ہے۔ایس پی اورڈی ایس پی تک پٹواری کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔

پھر تھانیدار نے ان سے زمین کے کاغذات کی تازہ نقلیں طلب کیں کہ جن سے ثابت ہو کہ جعل سازی کی گئی ہے..........مگر اسسٹنٹ ڈائریکٹر صاحب کے پاس تازہ نقلیں نہ تھیں۔وہ کئی برس پرانے کاغذات اٹھا کر لے آئے تھے،جنہیں تھانیدار نے مسترد کر دیا کہ ان پر کوئی کارروائی نہیں ہوسکتی..........چاروناچار اسسٹنٹ ڈائریکٹر صاحب پٹواری کے پاس پہنچے مگر اس نے فی نقل بیس ہزار روپے کا مطالبہ کر دیا اور اتنی رقم کی ادائیگی ان کے لیے کسی صورت ممکن نہ تھی۔انہوں نے تو اپنی ساری جمع پونجی سکول قائم کرنے پر خرچ کر دی تھی۔اب تو وہ ماہانہ پنشن پر گزارا کر رہے تھے۔

لہذا وہ اپنے ایک جاننے والے ڈی ایس پی کے پاس چلے گئے اور تمام ماجرا انہیں کہہ سنایا۔ڈی ایس پی صاحب نے انہیں سمجھایا کہ اراضی کی تازہ نقول کے بغیر قانونی تقاضے پورے نہیں ہوتے..................تازہ نقول اور پرانے کاغذات کے موازنے سے ہی معلوم ہوگا کہ جعل سازی کی گئی ہے..........اسسٹنٹ ڈائریکٹر صاحب اس مرحلہ پر بری طرح پریشان ہوگئے۔اگر پٹواری کے خلاف رشوت ستانی کا مقدمہ درج کرواتے ہیں تو اصل مسئلہ سے ان کا رخ ہٹ جائے گا اور کیا معلوم پٹواری پھر بھی تازہ کاغذات کی نقلیں نہ دے، بلکہ مزید بھڑک کر نمبردار کے ساتھ مل کر ان کے خلاف کوئی نیا محاذ یا مقدمہ کھڑا نہ کر دے۔آخر کار پے در پے صدمات سے انہیں چپ لگ گئی۔ان کی بوڑھی بیوی کرشمہ گاؤں والوں سے مانگ تانگ کر روکھی سوکھی کھا لیتی ہے..........اب وہ صرف ایک ہی موقع پر بولتے ہیں کہ جب گاؤں کا نمبردار کسی محفل میں لوگوں کو مخاطب کر کے پوچھتا ہے کہ ”گاؤں کا اسسٹنٹ ڈائریکٹر کون ہے؟“..........تو وہ غصے سے سیخ پا ہو کر با آواز بلند پکارتے ہیں..........”اسسٹنٹ ڈائریکٹر میں ہوں..........میں ہوں..........تو نہیں ہے..........“ تو ان کے جواب سے ساری محفل قہقہوں سے گونج اٹھتی ہے..................

☆☆☆☆☆

قربانی

ہمارے معاشرے میں بے نوا طبقہ کی قابل
رحم حالت پر لکھا گیا درد و الم میں ڈوبا
ہوا دل پر نشتر کی طرح ضربیں لگانے والا
حقیقی صداقت کا مظہر، شاہکار افسانہ

مطیع الحسن نے آج سہ پہر تین بجے اپنے خالہ زاد رفیع کی چہلم میں پہنچنا تھا۔رفیع بہت ملنسار، مخلص اور نیک سیرت شخص تھا۔جس کا اچانک حادثہ میں انتقال ہو گیا تھا۔بے چارے کی پانچ سالہ اور سات سالہ معصوم کونپل سی بچیاں تھیں۔جنہوں نے رفیع کی وفات کے موقع پر بین کرتے ہوئے ”ابوابو“ پکار کر سب کے دل ہلا کر رکھ دیئے تھے۔سب کی آنکھوں سے ان بچیوں کو روتے ہوئے دیکھ کر بے اختیار آنسو نکل آئے تھے۔رفیع کا ایک بچہ بہت چھوٹا تھا، جو شاید ابھی سال بھر کا بھی نہ ہوا تھا۔رفیع کی بیوی روہیلا مطیع الحسن کی بیوی ستارہ کی گہری سہیلی تھی اور اکثر ستارہ مشکل وقت پڑنے پر روہیلا سے چار پانچ ہزار روپے قرض لے لیا کرتی تھی۔جس کی واپسی کا تقاضا کبھی روہیلا نے نہیں کیا تھا اور بعض اوقات تو سال بھر بعد ستارہ روہیلا کا قرض چکاتی لیکن روہیلا پھر بھی فراخدلانہ پیشکش کرتی کہ ”اگر پیسے تمہیں ضرورت ہیں تو ابھی رہنے دو..........پھر لے لوں گی“۔

..........مطیع الحسن جب گھر سے صبح نکلا تھا تو اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ وہ آفس سے تھوڑا وقت پہلے نکل جائے گا تا کہ رفیع کی چہلم کی دعا میں بروقت شریک ہو سکے۔چنانچہ اس نے آفس کا فائل ورک جوں توں کر کے نمٹایا، مگر وہ دفتری اوقات سے پہلے باوجود کوشش کے دفتر نہ چھوڑ سکا۔اس کے ساتھ کے دوسرے کلرک نے اچانک چھٹی کر لی تھی۔اب مطیع الحسن کے لیے کام نمٹانے کے باوجود دفتری اوقات کار سے پہلے چھٹی کرنا اس لیے

ناممکن تھی کہ آفیسران بالا کو اگر اس کی غیر موجودگی میں کسی فائل کی ضرورت پڑ جاتی تو پھر بہت پیچیدگی اور مسائل پیدا ہو جاتے ۔اس کی انکوائری شروع ہو جاتی اور شاید تنخواہ بھی بند ہو جاتی ۔ مطیع الحسن جانتا تھا کہ جس مقام پر اس نے جہلم میں پہنچنا ہے، اگر بروقت گاڑی نہ پکڑ سکا تو پھر شاید وہ رفیع کے جہلم میں شریک ہی نہ ہو سکے ۔ جس سٹیشن سے گاڑیاں اس روٹ پر نکلتی تھی ، اسے ان سب کا ٹائم معلوم تھا ۔ ہر دوسری گاڑی کے درمیان دو دو گھنٹے کا وقفہ تھا ۔اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر وہ ساڑھے بارہ والی گاڑی نہ پکڑ سکا تو پھر وہ جہلم میں جس کا تین بجے کا وقت مقرر تھا ، نہیں پہنچ پائے گا ۔ دو گھنٹے گاڑی کی مسافت تھی ، جس میں دیر سویر بھی ہو جاتی تھی ، اس لیے وہ ساڑھے بارہ والی گاڑی پکڑ کر بمشکل اڑھائی پونے تین بجے اپنی مطلوبہ جگہ پر پہنچ سکتا تھا ۔ وہ تو شکر تھا کہ آج ہاف ڈے تھا ۔ ایک بجے آفس بند ہو جاتا تھا ، لیکن اسے سوا بارہ بجے آفس سے چھٹی کرنا تھی ، کیونکہ دس پندرہ منٹ آفس سے لاری اڈہ پہنچنے میں صرف ہو جاتے اور وہ بمشکل بھاگ دوڑ کر ساڑھے بارہ بجے والی گاڑی پکڑ سکتا تھا ، مگر شومئی قسمت کہ آج دوسرا کلرک بھی رخصت پر تھا ۔ ورنہ وہ اسے بتا کر بارہ بجے ہی نکل جاتا ۔ مطیع الحسن دفتر میں بیٹھا کسمسایا .... اس پر اضطراب طاری ہو گیا ۔ اس کا دل چاہا کہ وہ اٹھ کر چلا جائے .... کچھ بھی نہیں ہوگا ۔ پونا گھنٹہ پہلے چھٹی کرنے پر قیامت نہیں آ جائے گی .... مگر بجلی کے کوندے کی طرح اس کے ذہن میں یہ خیال لپکا کہ اگر خدانخواستہ آفیسران بالا کو کسی فائل کی ضرورت پڑ گئی تو لامحالہ اسے تلاش کیا جائے گا .... جب اسے دفتر میں موجود نہ پایا گیا تو پھر لازماً اس کی انکوائری ہو گی ۔

نئے ڈائریکٹر صاحب مزاج کے بہت سخت تھے ۔ ان کے دفتر آنے اور جانے کا کوئی ٹائم مقرر نہ تھا ۔ کبھی چھٹی کے وقت کے قریب دفتر آ کر بیٹھ جاتے اور مغرب تک بیٹھے رہتے ۔ اس دوران ان کے کلرکوں کو حاضر رہنا پڑتا .... آفیسران بالا تو وقت کے پابند تو نہیں ہوتے نا .... ان کا کوئی حاضری رجسٹر نہیں ہوتا ۔ جی چاہا دفتر میں آ گئے ، جی چاہا اٹھ کر چلے گئے .... مگر کلریکل سٹاف تو آفیسر کی موجودگی میں اپنی سیٹ نہیں چھوڑ سکتا ۔ نئے ڈائریکٹر صاحب ویسے بھی مزاج کے بہت تیکھے تھے ۔ بڑے
بڑے افسر بھی ان کا سامنا کرنے سے کتراتے تھے ۔ مطیع الحسن کو دو تین بار وہ اپنے آفس میں بلا چکے تھے ۔ ان کا اتنا رعب تھا کہ سب کانپنے لگ جاتے ۔ جب وہ ان

کے دفتر میں ان کے طلب کرنے پر حاضر ہوا تھا تو اپنی کرسی سے اٹھتے ہی اس پر کپکپاہٹ طاری ہو گئی تھی ، لیکن وہ اپنی پوری قوت مجتمع کر کے چند لمبے لمبے سانس لے کر اٹھا .... بڑی مشکل سے اپنی کپکپاہٹ پر قابو پایا .... لیکن جب وہ ڈائریکٹر صاحب سے مل کر ان کے آفس سے باہر نکلا تو اس کا پورا جسم پسینے سے شرابور تھا .... اس نے اپنی نشست پر پہنچ کر پانی کے پورے تین گلاس پیئے تھے ، کیونکہ اس کے جسم کا سارا پانی ڈائریکٹر صاحب کے رعب اور خوف سے پسینہ بن کر نکل گیا تھا .... جب سوا بارہ بجے کا وقت ہوا تو اس نے اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے سوچا .... کہ وہ آؤ تاؤ دیکھے بغیر اٹھ کر نکل جائے .... پھر اسے خیال آیا کہ ڈائریکٹر صاحب سے جا کر اجازت لے لے .... لیکن ڈائریکٹر صاحب نے سختی سے منع فرمایا ہوا تھا کہ نچلا سٹاف ان کے طلب کرنے کے بغیر ان کے آفس روم میں داخل نہ ہو ۔ ان کے ان احکامات کا باقاعدہ سرکلر جاری ہوا تھا اور دوسرا مطیع الحسن میں ویسے بھی بن بلائے ڈائریکٹر صاحب کے آفس میں جانے کی قطعی ہمت نہ تھی .... پھر اس نے اپنے اول الذکر خیال کے تحت کرسی سے اٹھ کر جانا چاہا کہ اچانک اسے اپنی اوقات یاد آ گئی .... یہ مہینے کے آخری دن تھے .... اس کے گھر کی اشیائے خورد و نوش ختم ہو چکی تھیں .... وہ رات کو صرف ایک چپاتی کھا کر سو گیا تھا ۔ صبح وہ اٹھا تو شدید بھوک کی وجہ سے اس پر نقاہت طاری تھی ۔ اس کی بیوی نے اس کے بیدار ہونے پر اسے بتایا کہ ''آج دودھ بھی ختم ہے اور چائے کے ساتھ ناشتہ میں کھانے کے لیے بھی کچھ نہیں ہے ....'' یہ بات سننے سے مطیع الحسن بستر پر لیٹے لیٹے ہی پیچ و تاب کھا کر رہ گیا ، کیونکہ رات کو اس کی بیوی نے گن گن کر تھوڑے سے گندھے آٹے کی قدرے سائز چھوٹا کر کے پانچ روٹیاں بنا کر پکائی تھیں ۔ ایک ایک روٹی تین بچوں نے بغیر تڑکے کے پکے ہوئے ساگ کے ساتھ کھالی تھی ۔ ایک روٹی خود مطیع الحسن کے حصے میں آئی تھی اور ایک روٹی اس کی بیوی کا مقدر ٹھہرتا تھی ، مگر ماں آخر ماں ہوتی ہے جو اپنے خون جگر سے اولاد کی پرورش کرتی ہے ۔ اس کی بیوی ستارہ نے اپنے حصے کی آدھی روٹی اپنے بڑے بیٹے کو دے دی تھی ، جو لڑکپن کی عمر سے نکل رہا تھا .... مطیع الحسن جانتا تھا کہ اس عمر میں بچوں کو مقوی غذا کی ضرورت ہوتی ہے ، جو اس طرح جز و بدن بنتی ہے کہ تمام عمر اس غذا کے اثرات جسم پر قائم رہتے ہیں .... اگر اس عمر میں بچوں کو متوازن غذا نہ ملے تو ان کا جسم کمزور ہو جاتا ہے اور

وہ بعد میں کئی طرح کے امراض کا شکار ہو کر اپنی طبعی عمر سے پہلے مر جاتے ہیں.........لیکن
.........لیکن یہ بھی ایک قدرت کا نظام ہے کہ ہمیشہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پوزیشن صرف
غرباء اور متوسط طبقے کے طلبہ وطالبات ہی حاصل کرتے ہیں.........شاید قدرت غرباء کے بچوں
کو زیادہ ذہانت سے نواز کر ان کی حق تلفی کا ازالہ کر دیتی ہے.........مطیع الحسن حالات کی
گرفت میں کچھ اس طرح محبوس تھا کہ وہ اپنے خاندان کی مالی فراخی کے لیے کچھ نہ کر پاتا تھا
.........اب صبح صبح اس کی بیوی نے بتا دیا تھا کہ ناشتے میں کھانے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔
تو بیوی کی اس اطلاع نے اسے بیدار ہوتے ہی ایک شدید ذہنی دباؤ کی ہیئت اختیار کر کے دبوچ لیا
تھا۔اس کا بلڈ پریشر بڑھنے لگا تو اس نے جلدی جلدی اٹھ کر باہر برآمدے میں لگے نل سے پانی کا
ایک گلاس بھر کر پیا اور منہ ہاتھ دھویا.........نل سے پانی گرنے کی آواز سن کر اس کی بیوی ستارہ
جو کچن میں بغیر دودھ کے پانی میں پتی ابال کر قہوہ بنا رہی تھی، باہر نکل آئی اور بولی:

''ہاں.........یاد آیا.........میں پرسوں اپنی امی کے گھر گئی تھی تو انہوں نے مجھے مکئی کا دو کلو آٹا دیا تھا.........رات کو یاد ہی نہ رہا کہ گندم کا آٹا ختم ہے تو مکئی کے آٹے کی روٹی پکا لیتی.........مگر مکئی کی روٹی میں نے کبھی پکائی بھی نہیں ہے۔شاید مجھ سے پک بھی نہ سکتی.........خیر آٹا ہے.........اسے میں توے پر بھون لیتی ہوں.........قہوہ کے ساتھ کھا لیں گے''۔

ستارہ کی زبانی دو کلو آٹے کا سن کر مطیع الحسن کی جان میں جان آئی.........اس کا بلڈ پریشر یکلخت نارمل ہو گیا.........چنانچہ اس نے پانی کی چھپک منہ پر ڈالتے ہوئے فوراً کہا۔

''ہاں.........بہت خوب.........جلدی جلدی مکئی کا آٹا بھون لو.........شدت کی بھوک لگی ہے.........میرے جسم پر کپکپاہٹ طاری ہے.........'' ستارہ نے کہا۔

''ابھی بھونتی ہوں.........'' اور پھر کچن میں چلی گئی۔

مطیع الحسن نے مکئی کے بھنے ہوئے آٹے کے دو پیالے بھر کر ان میں قہوہ ڈال کر حلوہ نما چیز بنا کر کھالی.........اور یہی ناشتہ اس کے بچوں اور بیوی نے بھی کیا تھا.........اب وہ شام کے کھانے کے لیے سوچ سے بچ گیا تھا، کیونکہ مکئی کا ایک کلو آٹا گھر میں موجود تھا۔وہ لوگ پیٹ بھر کر رات کا کھانا کھا سکتے تھے۔اگر چہ اس کی بیوی مکئی کے آٹے سے

روٹی پکانا نہیں جانتی تھی، لیکن اسے یقین تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح ٹیڑھی میڑھی روٹیاں پکا ہی لے گی۔

.........مطیع الحسن اپنی غربت، خستہ حالی کا سوچ کر کرسی سے اٹھتے اٹھتے کرسی پر اس طرح بیٹھ گیا گویا کہ کرسی سے چپک کر رہ گیا ہو.........وہ تو آفس کے منیجر صاحب کا بھلا ہو کہ انہوں نے دو تین بار چائے بسکٹ منگوائے تھے۔یوں دن میں دو بار مطیع الحسن کے پیٹ میں غذائی اجزاء پہنچ چکے تھے۔تب ہی وہ ابھی تک اپنے اندر توانائی محسوس کر رہا تھا.........ورنہ اس پر اب تک بھوک کی شدت سے کپکپاہٹ طاری ہو جاتی.........اس تصور کے ساتھ ہی مطیع الحسن کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ اگر وہ معطل ہو جائے یا اس کی تنخواہ بند ہو جائے تو وہ کیسے گزارہ کر پائے گا.........؟وہ اگر اپنے عزیز کے چہلم میں چلا گیا اور ڈائریکٹر صاحب نے اسے طلب کر لیا تو سب سے پہلے اس کی تنخواہ بند ہو جائے گی اور.........پھر.........پھر.........اس کے خاندان کا جو حال ہوتا.........وہ اس کے تصور سے ہی لرز گیا.........چنانچہ مطیع الحسن ٹک کر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اور ایک بجنے کا انتظار کرنے لگا۔

.........ٹھیک ایک بجے مطیع الحسن نے اپنا آفس چھوڑ دیا اور دوڑتا، ہانپتا، کانپتا جب لاری اڈہ پر پہنچا، تو سوا ایک بج گیا تھا.........اب دوسری گاڑی اڑھائی بجے نکلنا تھی.........جس پر اگر وہ بیٹھ جاتا تو بمشکل پانچ بجے اپنے عزیز کے چہلم میں پہنچ پاتا.........چنانچہ وہ بہت سوچ بچار کے بعد سڑک کی بائیں جانب اس امید پر کھڑا ہو گیا کہ شاید اسے کوئی بائیک، کار یا سرکاری گاڑی کی لفٹ مل جائے اور وہ چہلم میں شریک ہو سکے.........لیکن اسے کھڑے کھڑے 20 منٹ گزر گئے اور کوئی ایسی لفٹ نہ مل سکی.........پھر اس نے تہیہ کیا کہ جو بھی بائیک، کار والا اسے جاتا نظر آیا.........وہ اس سے لفٹ مانگ لے گا۔پندرہ بیس منٹ وہ اس مشقت میں پڑ کر ہر گزرنے والی گاڑی اور بائیک وغیرہ کو ہاتھ اٹھا کر روکنے کی کوشش کرتا رہا، مگر کوئی نہ رکا.........چند بائیک اور کار والوں نے اس کے روکنے کا اشارہ کرنے پر اسے بتایا کہ وہ اس کے مطلوبہ سٹاپ پر نہیں جا رہے۔مطیع الحسن کا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔اگر دو بجے تک بھی اسے بائیک یا کسی چھوٹی گاڑی کی لفٹ مل جاتی تو وہ تاخیر سے سہی، چہلم میں ضرور شریک ہو سکتا تھا، کیونکہ چھوٹی گاڑیاں اپنی تیز رفتاری کی وجہ سے اس مسافت میں

آدھے پونے گھنٹہ کا فرق ڈال دیتی تھیں اور بس سے آدھا پونا گھنٹہ پہلے پہنچتی تھیں۔مگر شومئی قسمت کہ مطیع الحسن کو ایسی کوئی لفٹ بھی نہ مل سکی، بلکہ بعض بائیک اور کاروں والے اس کے اس طرح رکنے کا اشارہ کرنے پر اس سے بدکلامی پر اتر آئے تھے کہ "اوئے...........ہٹ اُدھر جا...........اپنا کام کر..............."۔کوئی کہتا کہ "اگر ایسی مجبوری ہے تو اپنا بائیک خرید لے نا" اور اکثر بائیک والے بائیک کے ہینڈل سے ہی ہاتھ اٹھا کر اسے "نہ" کا اشارہ کرتے ہوئے گزر جاتے...........آخر کار مایوس ہو کر مطیع الحسن واپس گھر جانے کے لیے پلٹنے والا تھا کہ ایک قیمتی لگژری گاڑی زناٹے بھرتی اس کے پاس سے گزری...........مطیع الحسن نے دیکھا کہ اس گاڑی پر اس کے ادارہ کے صوبہ بھر میں سب سے بڑے افسر "سیکرٹری" صاحب تھے، جو گاڑی خود ڈرائیو کر رہے تھے۔یہ اسی جگہ کے رہنے والے تھے، جہاں مطیع الحسن کو اپنے خالہ زاد رفیع کے چہلم میں پہنچنا تھا...........لیکن وہ اتنے بڑے افسر کو کیسے رکنے کا اشارہ کرتا!!...........اسے یاد پڑا کہ ایک بار اس کے دفتر کے ایک کولیگ کو ڈائریکٹر صاحب نے سیکرٹری صاحب کی بیوی جو ایک ادارہ میں آفیسر تھیں، کی تنخواہ دے کر سیکرٹری صاحب کے آفس میں بھیجا تھا کہ جا کر میڈم کی تنخواہ کا چیک سیکرٹری صاحب کے آفس میں دے آ۔اس نے میڈم کی تنخواہ کا چیک سیکرٹری صاحب کے پرائیویٹ سیکرٹری کے بجائے براہ راست سیکرٹری صاحب کو جا کر دے دیا تو پھر سیکرٹریٹ سے مکتوب آ گیا کہ فلاں اہلکار براہ راست سیکرٹری صاحب کو کیوں ملا؟ کیونکہ ایسا طرز عمل سروس رولز کے منافی ہے...........اس کا یہ کولیگ بے چارہ کئی ماہ تک انکوائریاں بھگتتا رہا...........اگر مطیع الحسن اپنے ادارہ کے سیکرٹری صاحب کو رکنے کا اشارہ کر دیتا...........تو اس پر ضرور قیامت ٹوٹ پڑتی...........اس کے دیکھتے ہی دیکھتے سیکرٹری صاحب کی گاڑی فراٹے بھرتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہو گئی...........

...........یہ سیکرٹری صاحب حال ہی میں اس کے ادارے میں تعینات ہوئے تھے، جو سیکرٹری ہونے کے علاوہ شاعر اور ادیب بھی تھے۔اور ماضی میں مطیع الحسن کے ادارہ کے ڈائریکٹر بھی رہ چکے تھے۔مزاجاً وہ بھی بہت سخت طبع تھے۔مطیع الحسن نے انہیں کئی بار ٹی وی پروگراموں میں بھی دیکھا تھا........... جہاں وہ اپنے لکھے ہوئے اشعار اور نظمیں پڑھ کر سناتے تھے...........اس کے علاوہ وہ اخبارات میں بھی لکھتے رہتے تھے

...........ان کے کئی آرٹیکل مطیع الحسن نے پڑھ رکھے تھے...........مطیع الحسن کو بھی کسی زمانے میں لکھنے کا شوق تھا...........اس نے کچھ شاعری بھی کی تھی اور درجنوں آرٹیکل، مضمون وغیرہ بھی لکھے تھے...........جن میں سے اکثر مقامی اخبارات والوں نے شائع بھی کیے تھے، لیکن...........مطیع الحسن جانتا تھا اور کئی بار اسے اس کے دوستوں نے بتایا بھی تھا کہ ذرائع ابلاغ کی دنیا میں صرف نام بکتا ہے۔خواہ مضمون یا افسانہ کا معیار کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو........... لیکن شرط یہ ہے کہ کسی نامی گرامی شخصیت نے اسے لکھا ہو...........عام آدمی کتنا ہی اچھا کیوں نہ لکھے اس کی کاوش اخبارات میں شائع نہیں ہوتی...........سیکرٹری صاحب کے مضامین اور آرٹیکل بغیر کسی معیار کے اخبارات کے صفحات کی زینت بن سکتے تھے...........لیکن مطیع الحسن کا آرٹیکل خواہ سیکرٹری صاحب کے آرٹیکل سے کتنا ہی معیاری کیوں نہ ہوتا، اخبار والوں کے نزدیک وہ اہمیت نہ رکھتا تھا، جو سیکرٹری صاحب کے مضامین کو حاصل تھی...........مگر ہمارے معاشرہ میں پذیرائی اسے ہی ملتی ہے جو جتنے بڑے انتظامی عہدے پر فائز ہو...........الفاظ میں درد، اسلوب میں سوز، قلبی کیفیات وادراک کے وسیع وعمیق زاویے سے پیدا ہوتا ہے........... اوراحساس کا عمیق زاویہ مرغن غذاؤں سے بھرے ہوئے پیٹ اور مہنگی گاڑی میں گھومنے پھرنے والے شخص میں کبھی پیدا نہیں ہو سکتا...........دل کے بکھیڑے یوں ہی نہیں کھلتے...........ادیب بننے کے لیے ان گنت تھپیڑے اور ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں...........بڑی قیمت چکانا پڑتی ہے ....تب کہیں جا کر خدا کے فضل وکرم سے قلم میں روانی، سوز اور سلاست پیدا ہوتی ہے۔مطیع الحسن تو کوئی چھوٹی موٹی ضرورت کی کوئی چیز خریدتے وقت بچنے والے سکوں کو اپنی "زپ" لگی شلوار کی جیب میں اکھٹا کرتا رہتا تھا اور جب دس پندرہ سکے جمع ہو جاتے تو وہ اکثر ایک دانہ امرود یا دو دانے کینو خرید لیتا جو اس دن دوپہر کو بطور لنچ وہ کھا لیتا...........بعض اوقات فروٹ فروش اسے دھتکار دیتے کہ امرود کا دانہ پانچ روپے میں نہیں آ سکتا...........بھلا سیکرٹری صاحب کو زندگی کا یہ رخ دیکھنا کس طرح نصیب ہو سکتا تھا...........انہوں نے تو کبھی مکئی کا آٹا بھون کر ناشتہ نہیں کیا تھا ....ان کے گھر ڈیوٹی دینے والے سرکاری ملازم تو گاڑیوں میں تھیلے اور کاٹن بھر کر فروٹ لاتے تھے...........انہیں کیا معلوم کہ فروٹ مارکیٹوں میں عام آدمی کس حسرت اور تمنا سے "لگے سجے" فروٹ پر للچائی نگاہیں ڈالتے ہوئے، اسے چھوئے بغیر گزر جاتا ہے

۔مگر ایک پاؤ یا چھٹانک تک پھل نہیں خرید پاتا.........حالات کی سختی اور جبر انسان کا جگر چیر دیتی ہے.........اور پھر اس کے قلم سے نکلنے والا ہر لفظ اس کے دل اور جگر کو چیر کر ہی باہر نکلتا ہے.........مگر حالات کی ستم ظریفی اور جفائیں ہر آدمی کو ادیب نہیں بنا سکتیں۔ادیب صرف وہی بنتا ہے.........جس کی سرشت میں قدرت نے فطری انسلاخ ودیعت کر رکھا ہو.........

مطیع الحسن یوں ہی خیالات میں کھویا ہوا تھا،اس کے سامنے سے سڑک پر لوگ آ جا رہے تھے۔گاڑیاں، رکشے،کاریں اور موٹر سائیکل گزر رہے تھے،جن کے دھوئیں نے سڑک کے اوپر مستقل دھند کی شکل اختیار کر لی تھی،مگر مطیع الحسن کو مطلق کسی کا احساس نہ تھا۔جیسے وہ ایک لق و دق ریگستان میں کھڑا ہو......... جہاں آدم زاد کا نام ونشان تک نہیں ہے۔اس کے ذہن میں مختلف سوچیں آپس میں گڈمڈ ہو رہی تھی۔......... ہمارے پالیسی ساز ادارے عام آدمی کے لیے تنخواہ کی جو پالیسی بناتے ہیں،اس میں ہر گزرنے والے وقت کے ساتھ ساتھ عام آدمی اور مراعات یافتہ بڑے بیوروکریٹس کے مابین تنخواہ کی تفاوت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ایک طرف تنخواہ سات ہزار روپے ہے اور دوسری طرف دواڑھائی لاکھ......... یہ ایک ایسا ظلم ہے،ایسی حق تلفی ہے،جس کے سامنے بڑے سے بڑا ظلم حتیٰ کہ قتل جیسا سنگدلانہ جرم بھی نہیں ٹھہر سکتا.........قتل سے تو آدمی کی جان ایک ہی بار چلی جاتی ہے،لیکن یہاں لوگوں کو روز روز مارا جاتا ہے۔نہ وہ مرتے ہیں اور نہ جی سکتے ہیں.........اور نہ ظلم کی رسی ڈھیلی پڑتی ہے.........اگر کسی بڑے مراعات یافتہ شخص کو سات ہزار روپے ماہانہ دے کر اسے اس رقم میں اپنے خاندان اور بچوں کے ساتھ مہینہ گزارنے پر مجبور کیا جائے تب تو اسے چھٹی کا دودھ یاد آ جائے.........اس کی آنکھوں سے پٹی آناً فاناً اتر جائے.........معاشرے کے نبض شناسوں کو یہ سارا ظلم نظر آتا ہے.........مگر سب کو چپ لگی ہوئی ہے.........اور.........اور......... یہ چپ خالی از علت نہیں.........بلکہ وہ وقفہ ہے جو عذاب الٰہی سے پہلے قوم پر طاری ہوتا ہے.........کوئی بڑا آدمی،لاکھوں روپے ماہانہ تنخواہ پانے والا اور کروڑوں کی ماہانہ آمدنی رکھنے والا یہ نہیں سوچتا کہ میں رضا کارانہ طور پر اپنی ایک لاکھ تنخواہ سے پانچ دس ہزار اپنے غریب بھائیوں کے لیے چھوڑتا ہوں، وقف کرتا ہوں......... یہ برائے نام سرکاری ٹیکس کے علاوہ میرا اپنا حصہ ہے......... مذہب کے علمبرداروں میں بھی یہ سوچ پیدا نہیں ہو پائی.........ہاں خدا کے

منکروں کے ہاں کسی نہ کسی شکل میں ضرور موجود ہے.........

ایک حساس طبیعت رکھنے والا کوئی شخص،ادیب یا قلمکار جب معاشرے کا یہ امیج دیکھتا ہے تو اس پر قیامت گزر جاتی ہے......... مطیع الحسن کو یاد آیا کہ اس نے ایک تہلکہ خیز رپورٹ پڑھ رکھی تھی۔جس کا ذرائع ابلاغ میں بھی بڑا چرچا ہوا تھا کہ نامی گرامی لکھنے والے ادباء،شاعروں اور کالم نگاروں نے طبقہ اشرافیہ کی تعریفیں اور توصیفیں کر کے اعلیٰ مقام وعہدے حاصل کر رکھے ہیں.........اور.........اور طبقہ اشرافیہ سے قلم کی جنبش کے عوض کروڑوں روپے حاصل کرتے ہیں......... بھلا ایسے ادیبوں اور قلمکاروں کے الفاظ میں معاشرے کے صاحبان بست وکشاد کے لیے سامانِ عبرت کیسے پیدا ہو.........!!۔

مطیع الحسن ان ہی خیالات میں گم تھا کہ سڑک کے کنارے بائیک پر سوار ایک لڑکا آ کر رکا اور بائیک پر بیٹھے بیٹھے پکارا۔

''مطیع صاحب.........مطیع صاحب.........''

لیکن جواب ندارد.........مطیع صاحب کی نگاہیں اپنے بالمقابل کھڑے بائیک کو نہیں دیکھ رہی تھیں اور وہ دور آسمان کے افق پر کہیں خلاؤں میں گھور رہے تھے۔

لڑکا چند لمحے توقف کے بعد دوبارہ قدرے زور سے پکارا۔

''مطیع صاحب''

اس بار بھی مطیع الحسن پر کچھ اثر نہ ہوا۔

آخر کار لڑکا تعجب میں پڑ گیا.........وہ موٹر سائیکل سٹینڈ پر کھڑی کر کے اترا اور ان کے سامنے جا کھڑا ہوا اور بالکل مطیع الحسن کے قریب جا کر انہیں مخاطب کیا۔

''ارے مطیع صاحب!''

مطیع صاحب اپنا نام پکارنے والے کی آواز کانوں میں پڑنے پر چونکے اور افق سے نظریں ہٹا کر سامنے دیکھا تو ان کے محلّہ دار خباب کا اکلوتا بیٹا مرقوم کھڑا تھا۔چنانچہ وہ بوکھلا کر بولے۔

''ہاں.........مرقوم! کیا بات ہے؟''

''آپ گھر جا رہے ہیں؟ یہاں کیوں کھڑے ہیں؟''لڑکے

نے استفسار کیا..........مطیع الحسن نے جواب دینے کے بجائے پوچھا۔

''ٹائم کیا ہوا ہے؟'' ان کے لہجے میں قدرے حیرت تھی۔

لڑکے نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی اور کہا ساڑھے تین ہو گئے ہیں''۔

مطیع الحسن نے اپنے آپ سے مخاطب ہوتے ہوئے زیر لب کہا۔

''ساڑھے تین اور دو گھنٹے مزید..........ساڑھے پانچ..........نہیں..........اب نہیں پہنچ پاؤں گا..........'' پھر لڑکے سے مخاطب ہوئے..........۔

''میں نے گھر جانا ہے..........تم کہاں جا رہے ہو..........؟

..........لڑکا بولا۔

''آپ کو دیکھ کر کھڑا ہوا تھا..........آپ کو پکارتا رہا..........آپ نہ بولے تو بائیک کھڑا کر کے اتر کر آپ کے پاس چلا آیا..........آپ نے گھر جانا ہے؟..........میں گھر کی طرف ہی جا رہا ہوں..........''

''ہاں..........ہاں..........چلنا ہے..........گھر ہی تو جانا ہے.......... مطیع الحسن نے عجلت میں کہا..........

''چلیں..........آئیں پھر..........میں آپ کو چوک والے سٹور پر اتار دوں گا۔

چوک سے گزرتے ہوئے ان کی ملاقات محلّہ کے عقیدت خان سے ہو گئی..........جو سبزی مارکیٹ میں ریڑھی لگاتا تھا۔ اور ہاتھ میں دو بڑے بڑے تھیلے اٹھائے جا رہا تھا..........
اچانک اس سے مطیع الحسن کا آمنا سامنا ہو گیا تھا۔ اگر دور سے اس پر نظر پڑ جاتی تو وہ کہیں دائیں بائیں ہو جاتے..........لیکن اب اس نے انہیں آ ہی لیا تھا۔ مطیع الحسن کو دیکھتے ہی اس نے تھیلے ایک طرف رکھے اور بولا..........''۔ ''ہم غریب لوگوں کا بھی کچھ دھیان رکھا کریں بابو صاحب!..........ہم لوگ تو دیہاڑی لگا کر شام کو بال بچوں کے لیے کچھ لے کر جاتے ہیں..........بابو..........لوگوں کی طرح ہماری قسمت اور نصیب نہیں ہیں نا جی..........کہ مہینے کے مہینے تنخواہ سرکار سے لے لی..........اگر ہماری دیہاڑی نہ لگے تو ہمیں فاقہ لگ جاتا ہے..........ہمیں تو محنت کرنا پڑتی ہے..........آپ لوگ تو صبح بن ٹھن کر نکلتے ہیں..........اور سہ پہر واپس آجاتے ہیں۔ دیہاڑی گورنمنٹ کے ذمہ چڑھ جاتی ہے..........دوسرا مہینہ

ہے..........آپ نے میرے 180 روپے نہیں دیئے جی..........ہم لوگوں کے ساتھ بھی پیٹ ہے جی..........کچھ کھاتے ہیں تو جیتے ہیں..........کاٹھ کے تو نہیں بنے نا جی..........''۔

مطیع الحسن پر الجھاؤ کی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ سٹور والے سے نظریں چرا کر چھپتے چھپتے آگے بڑھے تھے..........اب عقیدت خان ناگہانی آفت جاں بن کر آدھمکا تھا..........
مطیع الحسن لجاجت سے بولے..........۔

''عقیدت خان کیا کروں!!..........کچھ بچتا ہی نہیں ہے تنخواہ سے..........آج بیس تاریخ ہے..........بس دس دن اور صبر کر لو.......... تنخواہ پر سب سے پہلے تمہاری رقم چکاؤں گا..........ناراض نہ ہونا..........مجھے سخت ندامت ہے۔ میں تمہارا سامنا کرنے کی ہمت نہ کر پا رہا تھا..........''

''نہ جی..........نہ..........ایسی بات نہیں ہے..........ہم محلے دار ہیں۔ ہمارا دکھ درد سانجھا ہے..........آپ جتنا مرضی ہے مجھ سے فروٹ ادھار لے لیا کریں..........لیکن مہینہ کی یکم دو کو ادائیگی کر دیا کریں بابو جی..........ہمارا بھی تو رزق کا مسئلہ ہے۔ نا جی..........''..........

بالکل عقیدت خان..........اطمینان رکھو..........یکم پر سب سے پہلے تمہاری ہی ادائیگی کروں گا۔''

''جی بہت مہربانی صاحب..........میں اب چلتا ہوں..........کھانا کھانے گھر آیا تھا..........ریڑھی پر وہ اپنے شاکی کو بٹھا کر..........'' ابھی عقیدت خان جانے بھی نہ پایا تھا کہ چوک والے سٹور کا ملازم دوڑتا ہوا آیا اور مطیع الحسن سے کہنے لگا۔

''آپ کو ''ارادت'' صاحب بلا رہے ہیں جی''

ارادت صاحب چوک والے کریانہ سٹور کے مالک تھے۔ جن کی نظروں سے بچ کر مطیع الحسن نکل آئے تھے۔ مگر عقیدت خان نے انہیں بیچ چوراہے میں روک لیا تھا اور ارادت صاحب کی نظریں ان پر یہاں کھڑا ہونے کی وجہ سے پڑ گئیں تھیں اور انہوں نے اپنا ملازم دوڑا دیا..........ارادت صاحب کے بلاوے کا سن کر مطیع الحسن کا سیروں لہو خشک ہو گیا..........وہ یکم تاریخ سے پہلے ارادت صاحب کا سامنا نہیں کرنا چاہتے تھے..........مگر اب بادل

نخواستہ انہیں ارادت صاحب کے سٹور پر جانا پڑ گیا..........ارادت صاحب نے انہیں حساب کتاب کا رجسٹر کھول کر دکھاتے ہوئے کہا۔

''یہ لیں..........آپ خود دیکھ لیں..........آپ کے ذمہ نوسو اٹھارہ روپے تین ماہ سے بقایا ہیں۔ آپ نے کہا تھا کہ یکم کو ادائیگی کروں گا..........لیکن آپ نے یکم کو کوئی ادائیگی نہیں کی.......... اب آپ یہ نوسو اٹھارہ روپے دے کر ہی جائیں''۔ مطیع الحسن اس افتاد سے گھبرا گئے اور سہمے سہمے بولے.......... ''دیکھیں..........''بہت دیکھ لیا جی..........''ارادت صاحب نے انہیں ٹوکا..........

''وہ نہیں..........نہیں..........آپ دیکھیں''..........مطیع الحسن بڑبڑا کر دوبارہ گویا ہوئے ....''وہ آپ دیکھیں کہ آج..........بیس تاریخ ہے۔بس یکم کو آپ کے پورے نوسو اٹھارہ روپے یہاں سے گزرتے ہوئے دے کر جاؤں گا..........''

''یہی بات تو آپ نے گزشتہ ماہ کہی تھی..........اب آپ ہمیں بے عزتی پر مجبور نہ کریں.......... نوسو روپے کی تکرار کرتے ہوئے شرم آتی ہے..........آپ عزت دار آدمی ہیں۔کل اگر میں سختی سے اپنی رقم مانگوں کہ ''اوئے مطیع! میرے پیسے دے کر جانا..........تو محلّہ میں آپ کی کیا عزت رہ جائے گی..........''

''نہیں جی نہیں..........گزشتہ ماہ آپ کی رقم الگ کر کے رکھی ہوئی تھی..........کہ میرے بیٹے کو گر کر چوٹ آ گئی..........جو مجبوراً مجھے خرچ کرنا پڑی..........لیکن اس ماہ ہر حال میں آپ کو دفتر سے واپس آتے ہوئے گھر پہنچنے سے پہلے آپ کو ادائیگی کر دوں گا''۔

''اچھا ٹھیک ہے..........مگر بھول نہ جانا''..........ارادت صاحب نے نیم دلی سے رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

چنانچہ مطیع الحسن نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا..........کہ وہ بیچ چوراہے میں بے عزت ہونے سے بچ گئے تھے۔خدا نے ارادت صاحب کا دل نرم کر دیا تھا۔بوجھل قدموں اور بجھے دل کے ساتھ گھر پہنچتے پہنچتے مطیع الحسن پھر ڈپریشن اور تناؤ کا شکار ہو چکا تھا..........اگرچہ آج کی رات گزارنے کے لیے اس کے گھر میں اس کی بیوی کو اس کی ماں کی طرف سے ملا ہوا ایک کلو مکئی کا آٹا تھا۔آج رات تو مطیع الحسن کے خاندان نے پیٹ کا ایندھن

پورا کر لینا تھا..........مگر ابھی مہینہ کے دس دن باقی تھے اور مطیع الحسن کو یہ خوف مارے جا رہا تھا کہ کل وہ کیا کھائیں گے۔ارادت صاحب تو شاید کوئی چیز اسے ادھار نہ دیں..........بچ بچا کے ایک عقیدت خان رہ جاتا تھا..........وہ ایک سو اسی روپے بقایا کے باوجود انہیں فروٹ یا سبزی ادھار دے سکتا تھا۔مگر صرف سبزی تو روٹی کا نعم البدل نہیں ہوتی۔سبزی سے مطیع الحسن کا خاندان دو چار دن گزار سکتا تھا،لیکن پیٹ میں روٹی کا ٹکڑا بھی پہنچنا ضروری تھا..........مگر سب سے زیادہ دکھ اور تاسف مطیع الحسن کو اس بات پر تھا کہ ہمیشہ معاشرے کے اسی مظلوم بے نوا اور پسے ہوئے نیم جاں طبقے سے قربانی مانگی جاتی ہے۔مذہبی اداروں اور تحریکوں کے نمائندے بھی اسی طبقے سے چندہ مانگنے کے لیے آ جاتے ہیں۔حکومت بھی مطیع الحسن جیسے لوگوں سے ٹیکس لیتی ہے۔دیگر فلاحی ادارے بھی اسی طبقہ سے قربانی کے طلب گار ہوتے ہیں۔گداگر بھی اسی طبقہ کی قربانی سے اپنا چولہا جلاتے ہیں۔تھانہ کچہری اور پولیس والوں کا رزق بھی اسی طبقہ کی بدولت ہے۔NGO,s والے بھی اسی مظلوم، بے نوا، کچلے اور پسے ہوئے طبقہ سے فلاحی فنڈ مانگتے ہیں۔مطیع الحسن جیسا طبقہ تھوڑی قربانیاں تو نہیں دیتا..........وقت کی قربانی، وسائل سے دستبرداری کی قربانی، اللہ کی زمین سے اپنا استحقاق چھوڑنے کی قربانی، اپنے جائز مالی حق کی قربانی، اپنی صحت کی قربانی، مراعات یافتہ طبقہ کے حق میں اپنی اولادوں کی تعلیم کی قربانی..........اپنے انسانی حق کی قربانی، اپنی ان گنت ضرورتوں کی قربانی..........اس ہی طبقہ سے تعلق رکھنے والوں کی فکری کاوشوں، سے بڑے بالا طبقات مستفید ہوتے ہیں..........یہی طبقہ ملک وملت میں علمی ڈھانچے کی بنیادیں استوار کر کے اشرافیہ کو پیش کرتا ہے۔اس ہی طبقہ کی اولادیں طبقہ اشرافیہ کے بگڑے ہوئے نوجوانوں کے حق میں اپنی تعلیمی قابلیت اور اہلیت سے دستبردار ہو کر انہیں فرسٹ ڈویژن دلانے کا موجب بنتی ہیں۔سوچ اس طبقہ کی ہوتی ہے مالک دوسرے بن جاتے ہیں۔اس ہی طبقہ کی حق تلفی سے بڑے لوگوں کی اولادیں ملک سے باہر مہنگے تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کرتی ہیں ....پھر یہی لوگ اس ہی طبقہ کی سوچ خرید کر خود مالک بن بیٹھتے ہیں، ملین اور ٹریلین کے حساب سے اپنا ناجائز سرمایہ ناجائز طریقہ سے باہر لے جاتے ہیں..........پھر اس ہی طبقہ اشرافیہ کی بنی ہوئی پالیسی درماندہ آدمی کو دفتری معاملات کے علاوہ بھی بڑے آفیسر سے براہ راست ملاقات کرنے کے عمل کو سروس رولز کے منافی قرار دیتی ہے۔

آخر ظلم اور حق تلفی کی کوئی حد تو ہو.............. آخر.......... یہ بے نوا طبقہ کتنی قربانیاں دے!!!
..............اس لمحے مطیع الحسن کو ایسا محسوس ہوا کہ آدم زادوں کا ایک جم غفیر قبر سے اگلے ہوئے مردوں کا تعفن زدہ میلا کچیلا کفن نوچ رہا ہے اور ننگ دھڑنگ مردے پورے کرہ ارض پر جا بجا بکھرے پڑے ہیں.......... یہ منظر دیکھ کر مطیع الحسن پر غشی کا دورہ پڑا.........اور..........اور وہ چکرا کر گر گیا..........دوسرے دن رفیع کی بیوہ روحیلہ مطیع الحسن کی بیوی ستارہ سے بغلگیر ہو کر بین پہ بین کیے جا رہی تھی کہ ہم دونوں کے نصیب کھوٹے ہو گئے ہیں۔ہم دونوں اجڑ گئیں۔ مطیع الحسن کے گھر کا چھوٹا سا برآمدہ عورتوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، جنہوں نے چارپائی پر پڑی مطیع الحسن کی میت گھیر رکھی تھی اور عقیدت خان ریڑھی لگانے والا بلند آواز میں پکار رہا تھا۔ ''ہٹو بہنو ....چارپائی سے.........چارپائی آزاد کرو......... بھائی مطیع کا جنازہ اٹھانے دو......... نماز جنازہ پڑھنے کا وقت ہو گیا ہے''۔

☆☆☆☆☆

گاؤں کا بابو

جہاں آوے کا آوا ہی بگڑا ہو، وہاں ایمانداری کے درخت پر پھل نہیں لگتا۔ ہمارے ڈوبتے ہوئے اداروں کے اندورنی احوال پر مبنی ایک فکر انگیز افسانہ

جھکی کمر، سوکھا جسم، خشخشی اور آدھی سے زیادہ سفید ڈاڑھی، ٹانکے لگے سیاہ جوتے، سالوں پرانی کالی واسکٹ پہنے، جس کا رنگ دھوپ کی تمازت سہتے سہتے پھیکا پڑ گیا تھا اور جس پر دھوپ پڑنے سے سرخی جھانکنے لگی تھی۔ سلیٹی رنگ کی شلوار قمیض پہنے جس میں ہلکے ہلکے داغ دھبوں نے مستقل بسیرا اختیار کر رکھا تھا۔ جب پچپن سالہ ادھیڑ عمر سلیم بابر بڑے صاحب کے آفس روم سے باہر نکلے تو ان کی پیشانی پر پسینے کے بڑے بڑے قطرے چڑھ آئے تھے۔ ان کی آنکھوں میں اضطراب اور چہرے پر پریشانی کی پرچھائیاں نمایاں تھیں.......... یقیناً بڑے صاحب نے سلیم بابر کو جھاڑ پلائی تھی یا کسی نئی افتاد کا دریچہ کھول دیا تھا.............. وہ تین دنوں سے براہ راست بڑے صاحب سے ملاقات کرنا چاہ رہے تھے.............، لیکن انہیں اپنا موقف اور عرضداشت بیان کرنے کے لیے موزوں استدلال نہیں سوجھ رہا تھا.......... پرانے گھاک قسم کے کلرک بڑے صاحبوں کے روبرو جب جاتے ہیں یا اپنی کوئی درخواست پیش کرتے ہیں تو وہ انتہائی عاجزانہ نوعیت کے چھان چھان کر لفظ استعمال کرتے ہیں۔ تاکہ کوئی لفظ صاحب کو گراں نہ گزرے۔ یہ غلامانہ رجحان درحقیقت انگریز حکومت کا تحفہ ہے، جس نے یہ کلچر برصغیر پاک و ہند میں پروان چڑھایا.............. بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ایسے موقعوں پر کلرک اپنی بساط اور تجربہ کے مطابق لغت کے سارے شیریں و عاجزانہ الفاظ چن لیتے ہیں..........اور پھر بڑے صاحب کا سامنا کرتے ہیں.............یہی صورت حال سلیم بابر کو پیش آ گئی تھی.............. ہوا یہ تھا کہ دفتر میں سلیم بابر کو ڈھیر سارا کام سونپ دیا گیا تھا، جسے پورا کرنا سلیم بابر کے لیے کسی طرح ممکن نہ

تھا...............آئے روز ہمارے ذرائع ابلاغ چیختے رہتے ہیں کہ ہمارے ادارے ڈوب رہے
ہیں۔کرپشن کمیشن اور رشوت ستانی کی دیمک نے ہمارے اداروں کو چاٹ چاٹ کر کھوکھلا کر دیا
ہے،لیکن بہت کم حلقوں کو شاید صحیح ادراک ہو کہ اداروں کے ڈوبنے کی اصل وجوہات کیا ہیں
...............اور اداروں کے اندر کیسی کیسی کڑھیاں پک رہی ہیں!!............۔اداروں
میں امانت دار،ایماندار،محبّ وطن،مخلص اور قومی مفادات کا تحفظ کرنے والے اہلکاروں و
آفیسروں کے لیے ہر دن ایک قیامت سے کم نہیں ہوتا...............ہمارا ادارہ جاتی نظام اپنے
اندر سے اس قدر بگڑ چکا ہے اور اتنا فرسودہ ہو چکا ہے کہ اس کی اصلاح کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی
............ادارے اپنے افسروں اور اہلکاران کے کردار سے بنتے اور بگڑتے ہیں
............اداروں کی اصلاح ضابطوں اور قانون سے نہیں ہو سکتی............اگر کوئی بالا مجاز
اتھارٹی ضابطوں اور قوانین سے اصلاح کرنا چاہے تو اس کی یہ سب سے بڑی بھول ہوگی............
جب شخصی کردار کو گھن لگ جائے تو قانون کی کچھ پیش نہیں چلتی............ایسے معاشرے تباہی کے
آخری دھانے پر پہنچ چکے ہوتے ہیں...............قانون کی آنکھ فرد کے اندر نہیں جھانک سکتی
............آپ کے پاس دستاویزی ثبوت ہیں............ٹھوس شواہد ہیں............اور درجنوں مجاز
اتھارٹیز ان شواہد کو حتمی قرار دیتی ہیں تو ضابطہ و قانون مجبور ہو جاتا ہے کہ ان ثبوت کی روشنی میں اپنا
فیصلہ دے۔قانون یہ نہیں پرکھ سکتا کہ مجاز اتھارٹیز نے یہ تمام ثبوت جعلی اور فرضی بنا رکھے ہیں
............یہی حال ہمارے ادروں کا ہے۔ادارے تباہ ہوتے ہیں،مگر کوئی بھی ذمہ داری قبول نہیں
کرتا............سارے یہی کہتے ہیں کہ اگر قانون کی نظر میں وہ مجرم ہیں تو ہر سزا کے لیے تیار ہیں،
لیکن بہت کم افراد قانون کی گرفت میں آتے ہیں...............اداروں کے ایماندار آفیسران کو
اس طرح الجھا کر پھنسا دیا جاتا ہے کہ ان کے ہاتھ پیر بندھ جاتے ہیں اور وہ کچھ نہیں کر پاتے اس
کے برعکس کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو جتنا زیادہ ایماندار ہے،اتنا ہی زیادہ اسے کرپٹ بنا کر دکھایا
جاتا ہے،کیونکہ ایماندار لوگ کسی ادارے میں خال خال ہی ہوتے ہیں۔جہاں آوے کا آوا ہی
بگڑا ہو،وہاں ایمانداری کا پھل نہیں لگ سکتا اور رفتہ رفتہ ایمانداری کا درخت سوکھ جاتا ہے۔
سلیم بابر کو اپنے ادارے میں مستقل تعینات ہوئے نو برس ہو گئے تھے............کم و بیش
آٹھ سال انہوں نے اس ادارہ میں کنٹریکٹ پر گزار دیئے تھے

............اور اب بڑھاپا تیزی سے ان پر حاوی ہوتا جا رہا تھا۔سر کے بالوں اور ڈاڑھی میں تیزی
سے چاندی اتر رہی تھی............اعضائے جسمانی مضمحل ہوتے جا رہے تھے............اور
............اور،کام و ذمہ داریاں بڑھتی جا رہی تھیں۔چالیس،بیالیس برس کے بعد آدمی زندگی کی
گھما گھمیوں اور زندگی کی تگ و دو کی رفتار کا ساتھ نہیں دے سکتا............وہ گوشہ عافیت چاہتا ہے
............لیکن گوشہ عافیت ایک سراب بن جاتا ہے۔سلیم بابر جب اس ادارہ میں کنٹریکٹ پر
تعینات ہوئے تھے تو انہیں شعبہ اکاؤنٹس میں لگا دیا گیا تھا،کیونکہ وہ قبل ازیں سولہ سترہ برس ایک
ایسے ادارہ سے وابستہ رہ چکے تھے۔جہاں کے لوگ اکاؤنٹ کے شعبہ کے ایکسپرٹ مانے جاتے
ہیں............چنانچہ انہوں نے نئے ادارہ میں اکاؤنٹس کے شعبہ میں کلیدی ذمہ داری سنبھال لی
تھی۔چار پانچ برس بعد انہیں ان کی لیاقت اور کام میں مہارت و خداداد استعداد کے پیش نظر
مستقل کر دیا گیا............لیکن اب حالات پہلے جیسے نہ رہے تھے............دس بارہ سالوں میں کئی
پرانے لوگ ریٹائرڈ ہو چکے تھے اور نئے لوگوں کی کھیپ بھرتی ہو کر آ رہی تھی۔یہ ان ٹرینڈ اور سفارشی
لوگ تھے اور کام کا سارا بوجھ سلیم بابر پر پڑتا جا رہا تھا،............پریشانی تو یہ تھی کہ نئے آنے والے
لوگوں میں اگر کوئی سنجیدگی سے اپنی ذمہ داری قبول کر کے آفس میں بیٹھتا تو وہ اسے ٹرینڈ کر دیتے
............مگر یہ نو تعینات شدہ لوگ اونچی سفارشوں اور پہنچ والے تھے............ایک المیہ یہ ہوا تھا کہ
ایک آفیسر جس کی علمی استعداد میٹرک کی سطح سے زیادہ نہ تھی،اونچی سفارش اور اپنے اثر و رسوخ و
تعلقات کے بل بوتے پر ادارہ کا زونل چیف بن گیا تھا،جسے ایڈمنسٹریشن کا کوئی خاص تجربہ نہ تھا
............اداروں کے ملازمین و آفیسران کا ایک سنجیدہ اور مہذب مزاج ہوتا ہے،مگر زونل چیف
میں سنجیدگی کا عنصر شاید دم توڑ چکا تھا............وہ بول چال اور نشست و برخواست میں لچر اور
بازاری زبان استعمال کرتے،جسے سن کر سن رسیدہ پرانے ملازمین کی نظریں زمین میں گڑ جاتیں
............سلیم بابر کو پہلے اکاؤنٹس کا کام سونپا گیا............پھر آڈٹ کے شعبہ کا............کیونکہ
شعبہ آڈٹ کے نئے تعینات ہونے والے اہلکار،وزراء اور دیگر اعلیٰ شخصیتوں کے قریبی عزیز یا
چہیتے تھے............جنہیں کام کی سوجھ بوجھ تو درکنار بلکہ وہ دفتر میں کبھی منہ دکھانے کے لیے بھی
نہیں آتے تھے............بس تنخواہیں انہیں گھر بھیج دی جاتی تھیں............دفتری نظام چلانے کے
لیے آفیسران بالا کی نظریں سلیم بابر پر ہی جا پڑیں............سلیم بابر بے

چار ا آنکھوں پر چشمہ چڑھائے، دن بھر فائلوں اور رجسٹروں پر جھکا اعداد وشمار کے میزان میں کھپا رہتا............وہ صبح سویرے سب سے پہلے دفتر آتا...........اور رات دس گیارہ بجے چھٹی کرتا ....اسے نہ اوور ٹائم کا اعزازیہ ملتا اور نہ کوئی اضافی الاؤنس.........نہ آفیسران بالا کی طرف سے حوصلہ افزائی، دلجوئی اور تحسین وستائش..........دن یوں ہی گزرتے چلے گئے..........لیکن جب پروڈکٹس کی ترسیل واندراج کا کام بھی ایسے ہی نئے تعینات ہونے والے ان ٹرینڈ اور سفارشی لوگوں کی وجہ سے بگڑنے لگا اور آفیسران کو حکام بالا کی طرف سے سرزنش ہونے لگی تو ان کا ماتھا ٹھنکا..........سارا نزلہ زونل چیف صاحب پر پڑا...........وہ بھی اونچی سفارش رکھنے والے ملازمین کے سامنے دبنے لگے...........اہلیت اور وصف سے عاری آدمی فطری طور پر ڈرپوک اور کمزور ہوتا ہے، کیونکہ وہ اپنے استحقاق سے زیادہ حاصل کر رہا ہوتا ہے۔زونل چیف صاحب بظاہر تو گریجویٹ تھے، لیکن ان کی علمی استعداد آٹھویں، نویں جماعت کے طالب علم سے زیادہ نہ تھی۔چنانچہ دفتری نظام بگڑنے کا سارا نزلہ زونل چیف صاحب کی ایڈمنسٹریشن پر پڑ رہا تھا ....انہیں کچھ سمجھ نہ آئی کہ پروڈکٹس کی ترسیل واندراج کے شعبے کو کس طرح فعال کیا جائے...........تو ان کے ذہن میں یہی بات نقش ہو چکی تھی کہ "سلیم بابر" ہرفن مولا ہے........... اور ترسیل واندراج کا کام بھی جانتا ہے...........ان کی فہم یہ جاننے سے قاصر تھی کہ سلیم بابر پہلے سے تقریباً چار پانچ ماہر لوگوں کا کام کر رہا ہے...........اور آڈٹ واکاؤنٹس کے دو شعبے مکمل طور پر اس کے سپرد ہیں اور ان شعبوں میں جو چار پانچ کلرک کام کر رہے ہیں، وہ دفتر منہ دکھانے کے لیے بھی نہیں آتے۔کسی کی سمجھ میں یہ بات بھی نہ آئی کہ ایک آدمی کوئی ایسی مشین یا روبوٹ نہیں ہوتا کہ جو نصف درجن لوگوں کا کام بیک وقت کر سکے۔چنانچہ زونل چیف صاحب نے ایک آفس آرڈر کے ذریعہ سلیم بابر کو پروڈکٹس کے شعبہ ترسیل واندراج کا کام بھی سونپ دیا........... جب سلیم بابر کو یہ آفس آرڈر ملا تو وہ سر پیٹ کر رہ گیا اور بڑے صاحب کو براہ راست ملنے کی قسم کھالی ....کیونکہ پہلے ہی اس کے ذمہ اتنا کام تھا کہ وہ اگر بغیر سوئے اور کھائے پیئے 24 گھنٹے مسلسل کام کرتا تو پھر بھی اس کے ذمہ لگا کام ختم نہ ہوتا...........لیکن اب جب وہ بڑے صاحب سے مل کر باہر آیا تو اس کے پسینے چھوٹ رہے تھے۔کیونکہ بڑے صاحب نے اس کی عرضداشت سماعت فرما کر کہا تھا کہ " کام کرنا چاہیے...........کام کرنا اچھی

بات ہے"اس موقع پر سلیم بابر کے تمام منتخب الفاظ اپنی افادیت کھو گئے تھے...........اب جب مضمحل اعصاب ادھیڑ عمر سلیم بابر ان سے مل کر باہر نکلا تو شدید افسوس، ہیجان اور اضطراب سے اس کا دل پھٹا جا رہا تھا...........سلیم بابر کا آخری حیلہ بھی بے کار ثابت ہوا تھا۔سلیم بابر ایک دورافتادہ گاؤں کے رہنے والے تھے۔ان کا پورا گھرانہ مذہبی رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔تعلیم بہت کم تھی اور پورے گاؤں میں صرف دو آدمی پرائمری تک پڑھے ہوئے تھے۔سلیم بابر اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ان سے بڑے تین چار بھائی محنت مزدوری اور زمینداری کرتے تھے۔ سلیم بابر سے ان کی والدہ کو بہت ہی زیادہ محبت تھی۔ان کی مامتا کا یہ حال تھا کہ جب چھوٹا سلیم بابر تیسری جماعت میں پڑھتا تھا تو والدہ ایک نسبتاً بلند جگہ پر اکثر اوقات بیٹھ کر سکول کے بچوں کو دیکھتی رہتیں کہ کہیں کوئی شرارتی بچہ سلیم بابر سے نہ چھیڑے...........وہ ہر ہفتے سلیم بابر کے ابا کو سکول میں بھیج دیتیں کہ جا کر ماسٹر صاحب سے معلوم کریں کہ سلیم بابر کو بچے تنگ تو نہیں کرتے .... سلیم بابر نے چھ سات سال کی عمر میں گھر میں ہی اپنی والدہ اور والد سے قرآن شریف پڑھ لیا تھا اور انہیں بہت سی قرآنی دعائیں ازبر ہو گئی تھیں۔کمزور جان سلیم بابر بچپن میں ہی نیک طبیعت تھا، جس میں سادگی اور شرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔گھر میں سب کا چہیتا تھا۔ ماں باپ اور بڑے بھائی معصوم سلیم بابر کو ٹوٹ کر چاہتے تھے۔والدہ تو اسے آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیتی تھیں...........سلیم بابر ہر جماعت میں فرسٹ آتا رہا اور خدا کے فضل وکرم سے سینکڑوں برسوں کا ریکارڈ توڑتے ہوئے سلیم بابر نے امتیازی نمبروں سے میٹرک کا امتحان پاس کر لیا........... تو سلیم بابر کی اماں نے اپنے بڑے بیٹے کو شہر بھیج کر سیروں مٹھائی منگوائی اور گاؤں کے ہر گھر میں مٹی کی رکابیوں میں بھر کر بھیجی...........گویا گاؤں میں سلیم بابر کے میٹرک پاس کرنے کی خوشی میں جشن برپا ہو گیا تھا۔سلیم بابر سے خط پڑھوانے اور لکھوانے دور دور سے دیہاتی آتے اور اسے دعائیں دیتے...........سلیم بابر نے میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں میں پاس کرنے کے لیے تھوڑی محنت تو نہیں کی تھی، جب گھر والے سو جاتے تو سلیم بابر کائل کی لکڑی جلا کر اس کی روشنی میں بیٹھا پڑھتا رہتا...........سلیم بابر پر ایک ہی دھن سوار رہتی کہ کبھی سکول کی طرف سے دیئے گئے ہوم ورک میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔آخر کار سلیم بابر میٹرک کے بعد ایک سرکاری ادارہ میں کلرک تعینات ہو گیا...........وہ گاؤں کا پہلا آدمی تھا، جس نے گورنمنٹ

سروس اختیار کی تھی...........ملازمت کرنے کے بعد سلیم بابر گاؤں بھر میں بابو مشہور ہو گیا تھا ....اور سلیم بابر کی اماں بڑے ارمانوں کے بعد اپنے بابو کے لیے گاؤں کی ایک خوبصورت دوشیزہ بیاہ لائی تھیں، جسے وہ اپنے بیٹے سے کم نہ چاہتی تھیں۔سلیم بابر نے شہر میں آ کر محنت کا وطیرہ ترک نہ کیا۔دفتر میں اسے سخت سے سخت اور مشکل کام سونپا جاتا تو وہ اپنے محنتی مزاج کی وجہ سے اس کام کو بخوبی نبھاتا...........اس کے ساتھ سلیم بابر نے ایف اے کا امتحان بھی نمایاں پوزیشن لے کر پاس کر لیا۔وہ ہر ماہ اپنی تنخواہ کا کثیر حصہ والد اور والدہ کو دے آتا...........دن بڑے خوشی خوشی گزر رہے تھے۔چھ سات برسوں میں ہی سلیم بابر جونیئر کلرک سے ترقی پا کر سکیل 14 میں پہنچ گئے تھے اور اگلے مرحلے میں انہوں نے افسر بن جانا تھا کہ ان کا تبادلہ ایک سال کے لیے ایک دور افتادہ تحصیل میں کر دیا گیا۔یہ سروس کے حوالہ سے سب سے مشکل سٹیشن تھا۔یہاں کے لوگ سرکاری اہلکاروں کو اپنے جال میں بری طرح پھانس لیتے تھے۔خیر...........سلیم بابر نے جب وہاں جا کر پہلے اہلکار سے چارج لیا تو یہاں ان سے ایک ایسی خطا سرزد ہوئی کہ ساری عمر جس کا انہیں خمیازہ بھگتنا پڑا...........ہوا یوں کہ کاغذات، فائلوں، رجسٹروں اور زرضمانت (سی ڈی آر) کی جانچ پڑتال کرتے ہوئے دو دن صرف ہو گئے۔سلیم بابر کو اپنی اماں کی بیماری کی فکر دامن گیر تھی، کیونکہ انہیں اپنے گاؤں کے ایک شخص کی زبانی چند ہی دن پہلے معلوم ہوا تھا کہ ''اماں'' کو بہت تیز بخار چڑھ آیا ہے۔سلیم بابر چاہتے تھے کہ وہ جلد از جلد چارج لین دین سے جان چھڑا کر اماں کے پاس پہنچ جائیں اور ان کا علاج معالجہ کروائیں۔ان کی اماں نے ان کو بے بہا شفقت اور پیار دیا تھا۔اس نئی جائے تعیناتی سے ان کا گاؤں قریب ہی پڑتا تھا۔اس سٹیشن کے پہلے اہلکار نے تمام فائلوں اور رجسٹروں کا حساب کتاب دے کر انہیں دو تین آہنی الماریاں ایسی دکھائیں، جن میں کروڑوں روپے کی زرضمانتیں (سی ڈی آر) پڑی تھیں۔یہ چھوٹی چھوٹی رقمیں تھیں۔سو، پانچ سو، ہزار، پانچ ہزار کی سی ڈی آرتھیں جن سے الماریاں بھری ہوئی تھیں۔ان کو گننے میں اور رقم کی مجموعی میزان میں کم از کم پورا ایک دن لگ سکتا تھا۔سلیم بابر اور چارج دینے والے اہلکار نوید عالم نے جب مل کر ایک الماری کی سی ڈی آر کا حساب کتاب کیا تو تین گھنٹے صرف ہو گئے۔نوید عالم نے انہیں دوسری دو الماریوں کی فہرست تھما کر بتایا کہ یہ دوسری دو الماریوں کی فہرست ہے اور پھر الماریاں کھول کر دکھائیں کہ تمام سی ڈی آر ان الماریوں میں محفوظ

ہیں...............اگر آپ چاہتے ہیں کہ گن لی جائیں تو گن لیتے ہیں۔ساری سی ڈی آرز ان الماریوں میں بحفاظت رکھی ہوئی ہیں۔اگر آپ مجھ پر بھروسہ اور اعتماد کرتے ہیں تو ان کو گننے کی ضرورت نہیں۔اس طرح ہم پورے ایک دن کی مغز کھپائی سے بچ جائیں گے'...............سلیم بابر جو پہلے ہی اپنی اماں کی بیماری کی وجہ سے پریشان تھے اور جلد از جلد اماں کے پاس پہنچنا چاہتے تھے، نے کہا کہ ''ٹھیک ہے، ہم ان کو نہیں گنتے...........مجھے آپ پر اعتماد و بھروسہ ہے''۔

سلیم بابر کی رضامندی پا کر چارج دینے والے نوید عالم نامی اہلکار نے سی ڈی آرز کی فہرست سلیم بابر کے حوالے کر دی اور سلیم بابر تمام الماریاں مقفل کر کے بیمار اماں کو دیکھنے اپنے گاؤں چلے گئے۔

...............کوئی ہفتہ بھر بعد انہیں خیال آیا کہ ان دو الماریوں کی سی ڈی آرز گن کر اطمینان کر لینا چاہیے۔چنانچہ انہوں نے اپنے ماتحت کلرک کو ساتھ رکھ کر جب ان کو گن کر ان کا میزان کیا تو انکشاف ہوا کہ چار لاکھ روپے کی سی ڈی آرز انہیں دی گئی فہرست کے مطابق الماریوں میں موجود ہی نہیں ہیں۔جبکہ وہ چارج لین دین کی تمام دستاویزات پر دستخط کر چکے تھے۔اس اچانک نئی افتاد سے تو سلیم بابر کو فرشتے چھوڑ گئے اور شریف النفس گاؤں کے بابو سلیم بابر کو اپنی جان بچانے کی کوئی تدبیر نہ سوجھ سکی...............ان پر سرکاری طور پر ایف آئی آر درج ہو گئی۔سب سے پہلے ان کی تنخواہ بند ہوئی اور پھر وہ پابند سلاسل ہو گئے...........پھر...........یہ مقدمہ لڑتے لڑتے کئی برس گزر گئے۔جیل سے تو انہیں تقریباً پانچ برس بعد رہائی مل گئی لیکن وہ انتہا درجہ مالی تنگ دستی کا شکار ہو گئے۔اس مقدمہ پر انہیں زرکثیر صرف کرنا پڑا جو انہوں نے اپنے بھائیوں اور گاؤں کے لوگوں سے چھوٹے چھوٹے بے شمار قرض لے کر پورا کیا...............لیکن سانپ نکل گیا پر دم رہ گئی کے مصداق ان کا یہ مقدمہ آخری مرحلہ پر اٹک گیا...............آخر کار انہوں نے اپنے حصے کی وراثتی زمین گروی رکھ کر قرضہ لیا...............سلیم بابر کو ملازمت سے جبراً ریٹائرڈ کر دیا گیا اور پنشن سے چار لاکھ روپے کی کٹوتی ہو گئی...............باقی کل پنشن سے پچاس ہزار روپے سلیم بابر کو جو ملے وہ اسی دن قرض خواہوں کو ادا کر دیئے گئے اور گاؤں کے بابو سلیم بابر، بے بسی، بے روزگاری، محرومی و بے نوائی محتاجی و ناداری کے ایک تپتے ہوئے ریگزار میں کھڑے تھے...........جہاں ان کا کوئی پرسان حال نہ تھا...............نازک و

کمزور جسم سلیم بابر نے اپنے بھائیوں کے کھیتوں پر چار و نا چار جسمانی مشقت و محنت شروع کر دی۔ کیونکہ اماں کی خواہش پر انہوں نے اپنے مقدمہ سے کوئی سال بھر پہلے شادی بھی کر لی تھی اور اب ان کے دو بچے بھی تھے اور زندگی قائم رکھنے کے لیے پیٹ کا ایندھن بھی پورا کرنا ضروری تھا۔ اپنے کھیت تو وہ پہلے ہی گروی رکھ کر قرضہ لے چکے تھے............ مگر جلد ہی انہیں معلوم ہو گیا کہ وہ جسمانی مشقت کا کام کام کرنے کے اہل نہیں ہیں.......... کیونکہ ان کا جسم شدید جسمانی مشقت کا متحمل نہ تھا............ چنانچہ انہوں نے بھائیوں سے مشورہ کر کے کچھ مزید قرضہ لے کر گاؤں میں کریانہ کی دوکان ڈال لی۔ اس کسمپرسی کے عالم میں والدین بھی سلیم بابر کو داغ مفارقت دے گئے.......... مگر بھائیوں نے ان کا بھرپور ساتھ نبھایا.......... کوئی سال ڈیڑھ سال بعد سلیم بابر کو احساس ہوا کہ چند گنی چنی بنیادی ضرورت کی اشیاء رکھنے والی یہ دوکان عیالدار سلیم بابر کا پیٹ نہیں پال سکتی.......... اوپر سے قرض خواہوں کے روز بروز بڑھتے ہوئے تقاضے شدید ہوتے جا رہے تھے.......... طوہاً و کرہاً سلیم بابر کو گاؤں چھوڑنا پڑا کیونکہ قرض خواہوں نے ان کی ناک میں دم کر رکھا تھا............ وہ گاؤں چھوڑ کر شہر میں آ گئے اور اللہ کا کرم یہ ہوا کہ انہیں ایک ادارہ میں کنٹریکٹ کلرک کی جاب مل گئی.......... مگر دو تین ہزار تنخواہ میں ان کے لیے بال بچوں کا پیٹ پالنا اور انہیں تعلیم دلوانا مشکل ہو گیا، لیکن یہ سہارا بھی ایک نعمت سے کم نہ تھا۔ انہوں نے اپنے بچوں کی اعلیٰ تعلیم کے جو خواب دیکھے تھے وہ پورا کرنے کی اب کوئی سبیل باقی نہ رہی تھی.......... انہوں نے انتہا درجہ مفلسی کے ہاتھوں مجبور ہو کر چھٹی جماعت میں پڑھنے والے اپنے بیٹے کو کراچی اپنے ایک جاننے والے شخص کے ہاں بھیج دیا کہ وہ ان کے بچے کو کسی فیکٹری میں لگا دے.......... لیکن چند ہی ماہ گزرے تھے کہ ان کا یہ بیٹا ٹریفک حادثے میں وفات پا گیا، جس کا صدمہ درماندہ حال سلیم بابر کو سہنا پڑا۔ ان کی بیوی کو بیٹے کی موت کا صدمہ پر غش آنے لگے............ لیکن جواں ہمت سلیم بابر نے پا یہ استقلال سے اس صورت حال کا مقابلہ کیا۔ انہوں نے جوں توں کر کے چند سال گزارے اور پھر اپنے ایک بیٹے کو جو اب آٹھویں کلاس کا طالب علم تھا، سکول سے اٹھا کر درزیوں کا کام سکھانے بٹھایا تا کہ ان کا مالی بوجھ ہلکا ہو سکے۔............ لیکن جب بدنصیبی آتی ہے تو کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی.......... ان کا یہ بیٹا تعلیم ادھوری چھوڑنے اور اپنے والد کی شدید مالی مجبوریوں کے باعث شدید احساس محرومی کا شکار ہو گیا تھا.......... اور

ایک دن وہ گھر چھوڑ کر کہیں چلا گیا۔ تنگ دست سلیم بابر نے اسے ڈھونڈنے کی حتی المقدور کوشش کی، مگر اس کا کوئی اتا پتا نہ لگ سکا.......... ان کی بیوی بچے کے غم اور صدمہ سے رو رو کر بے حال ہو گئی۔ جب دو اڑھائی سال کی تلاش و بسیار کے باوجود انہیں اپنے بیٹے کا کوئی سراغ نہ ملا، تو ممتا کی ماری بے چاری ان کی بیوی کو متواتر صدمہ کی وجہ سے بیماریوں نے آ لیا............ کرایہ کے مکان میں رہنا دو بیٹوں اور تین بیٹیوں کے اخراجات کا بوجھ ایک کلرک کی استطاعت سے باہر ہوتا ہے............ اوپر سے ان کی اہلیہ شدید ڈپریشن اور بلڈ پریشر کی مریضہ بن گئی.......... خود سلیم بابر کا بھی مسلسل اور طویل پریشانیوں سے فشار خون بلند رہنے لگا.......... اور انہیں بھی بلڈ پریشر نارمل رکھنے کے لیے دوا لینا پڑی.......... وہ تو خدا کا شکر تھا کہ اس ادارہ نے انہیں مستقل کر دیا تھا، لیکن کام کی زیادتی کا اتنا بوجھ ان پر ڈال دیا گیا تھا کہ وہ کسی طرح اس کام کو پورا نہ کر پاتے تھے۔ محرومیت، بے بسی اور بے بضاعتی انسان کو کھوکھلا کر دیتی ہے۔ اس سے جینے کی امنگ چھین لیتی ہے............ درماندہ حال سلیم بابر کے گھر اکثر فاقے لگتے.......... گھر میں پریشانیوں اور بیماریوں نے ڈیرے ڈال لیے تھے۔ علاج کروانے کی استطاعت تو انہیں تھی نہیں، لیکن پھر بھی قرض لے کر انہوں نے اپنی اہلیہ کا علاج کروایا، لیکن ڈپریشن اور محرومیت دواؤں سے دور نہیں ہوتی نا............ ان کی اہلیہ کا جواں سال بیٹا گم ہو گیا تھا اور دوسرا حادثاتی موت سے داغ مفارقت دے گیا تھا.......... جس کا غم اندر ہی اندر اسے کھائے جا رہا تھا............ دوسری افتاد ان پر یہ پڑ گئی کہ ان کی وراثتی زمین جسے گروی رکھ کر قرضہ لیا گیا تھا، پر مستقل قبضہ جما لیا گیا۔ تباہ حال سلیم بابر نے پھر بھی ثابت قدمی اور استقامت کا مظاہرہ کیا اور اپنی تنخواہ کے خلاف بینک سے قرضہ لے کر کچھ رقم کی ادائیگی کر کے اپنی آبائی زمین چھڑوائی.......... جس ادارہ میں ان پر خرد برد کا مقدمہ بنا ہوا تھا، اس ادارہ میں ان کے ساتھ کام کرنے والے ان سے جونیئر اہلکار اب سکیل بیس اور اکیس تک جا پہنچے تھے اور لاکھوں میں تنخواہ پاتے تھے.......... انہیں دیکھ کر سلیم بابر کا دکھ اور بڑھ جاتا............ اندر سے ٹوٹا ہوا آدمی آخر کب تک سختیاں اور محرومیاں سہہ سکتا ہے۔ سلیم بابر کو سب سے بڑی پریشانی اپنے آفس ورک کی تھی۔ ایسا مشکل، زیادہ اور اعداد و شمار کا بے تحاشا کام انہیں سونپ دیا گیا تھا.......... کہ جس کو مکمل کرنے پر سلیم بابر کے لیے تو کیا.......... نصف درجن کلرکوں کے بس کی بات بھی نہیں تھی............ لیکن

............لیکن............اب بڑے صاحب نے بھی ٹکا سا جواب دے دیا تھا
............مسلسل محرومیاں، حق تلفی، اگر آدمی میں استقامت اور خدا پر کامل یقین اور شائستہ صبر نہ ہو تو آدمی کو انتہا درجہ مایوسی کے عمیق گڑھے میں دھکیل دیتی ہے............ایسے مرحلے پر پہلے آدمی میں ذرہ ذرہ قنوطیت سر ابھارنے لگتی ہے............پھر قنوطیت کا پودا تناور درخت بن جاتا ہے اور آدمی خبطی بن جاتا ہے۔ اس کے سب سے زیادہ اثرات جسم پر مرتب ہوتے ہیں، معدہ جواب دے دیتا ہے، بلڈ پریشر کا عارضہ لاحق ہو جاتا ہے اور پھر............پھر............جسم انسانی کا سارا ڈھانچہ لرزنے لگتا ہے۔ اس کیفیت میں آدمی معاشرہ کو کوستا ہے، اپنے آپ کو کوستا ہے، اپنا حق مارنے والوں کو کوستا ہے، واہی تباہی کہنے لگتا ہے............اور آخر کار یا تو حواس کھو بیٹھتا ہے یا پھر مالخولیا کا مریض بن جاتا ہے............بھلے سلیم بابر نے مذہبی ماحول میں پرورش پائی تھی
............لیکن خدا پر کامل یقین اتنی آسانی سے نہیں بنتا............

بڑے صاحب کے انکار کا نتیجہ یہ نکلا کہ سلیم بابر پر ڈپریشن کے دورے پڑنے لگے۔
دفتر والے پھر بھی انہیں چھٹی دینے پر تیار نہ تھے............لیکن جب ایک آفیسر نے گھر جا کر سلیم بابر کی حالت دیکھی تو اس نے بالا آفیسران کو سفارش کی سلیم بابر کو میڈیکل رخصت پر بھیج دیا جائے۔ اس کی حالت ایسی نہیں کہ وہ آفس ورک کر سکے............ایک سال جوں توں گزر گیا
............سلیم بابر کی حالت نہ سنبھل سکی تو مجبوراً دفتر والوں نے سلیم بابر کو معمولی سی پنشن دے کر ریٹائر کر دیا۔ پنشن کا زیادہ حصہ سلیم بابر کی تنخواہ کے خلاف لیے جانے والے قرض میں منہا کر دیا گیا اور ڈیڑھ دو لاکھ روپے جو سلیم بابر کو مل پائے، چند ہی ماہ میں اس کی بیوی اور اس کے علاج پر خرچ ہو گئے۔

ریٹائرڈ ڈائریکٹر نوید عالم اچانک ہی گرفتار ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے ڈاکٹر اور تحصیلدار بیٹوں کو بھی معلوم نہ ہو سکا تھا۔ کرپشن کرنے والے کمیشن خوروں اور رشوت خوروں میں بھی صبر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے............اللہ نے کسی بھی آدمی کو اوصاف سے خالی نہیں رکھا، لیکن ریا کار لوگ صبر کو منفی طرز میں استعمال کرتے ہیں۔ یہ لوگ سالوں بلکہ عشروں مناسب مواقع کی تاک میں رہتے ہیں............اور پھر دونوں ہاتھوں سے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہیں............
نوید عالم وہ شخص تھے، جنہوں نے سلیم بابر کو تیس سال پہلے چارج دیا تھا

اور دو الماریوں میں پڑی لگ بھگ چار لاکھ روپے کی سی ڈی آرز خود اپنے پاس رکھ لی تھیں اور چارج لین دین کے کاغذوں پر سلیم بابر سے دستخط کروا لیے تھے............ان سی ڈی آر کو ڈائریکٹر کی جعلی مہروں کے ذریعے انہوں نے ایک بنک اہلکار سے مک مکا کر کے اپنے اکاؤنٹ میں جمع کروا دیا تھا............اور تقریباً اٹھائیس برسوں میں یہ چار لاکھ روپے نصف کروڑ سے تجاوز کر گئے تھے............اس حقیقت کا سوائے نوید عالم اور متعلقہ بنک کے ایک آفیسر کے علاوہ کسی کو علم نہ تھا............یہ آفیسر بھی ریٹائر ہو گیا تھا............اب انہیں یہ رقم بنک سے نکلوانے میں کوئی خطرہ یا تشویش نہ تھی............اس معاملہ کو تیس سال بیت چکے تھے اور سلیم بابر خرد برد کے الزام میں سزا پا چکا تھا............چنانچہ نوید عالم یہ کروڑ کے لگ بھگ روپے بنک سے نکلوانے کی تیاری کر رہے ہی تھے کہ اچانک بازی الٹ گئی............بنک کے ایک آفیسر نے دوران آڈٹ، آڈٹ آفیسر کے پرانا ریکارڈ طلب کرنے پر جب الماریوں سے پرانا ریکارڈ نکالا تو کہیں دبی ہوئی تیس سال پرانی فائل بھی سامنے آ گئی، جس کا ملاحظہ کرنے پر انکشاف ہوا کہ ایک ادارہ کی تیس سال پرانی CDR,s غیر سرکاری اکاؤنٹ میں پڑی ہیں۔ جب یہ معاملہ مزید کریدا گیا تو معلوم ہوا کہ تیس سالوں کا منافع بھی ادارہ کو ادا نہیں ہوا۔ بنک آفیسر اور آڈٹ آفیسر حیرت میں پڑ گئے کہ تیس سالوں سے سرکاری نمبر کی سی ڈی آر کا منافع ادارہ نے کیوں نہیں لیا اور یہ غیر سرکاری اکاؤنٹ میں کیوں جمع ہیں............اس سلسلہ میں متعلقہ ادارے کو بنک کی طرف سے خط لکھا گیا
............یوں یہ معاملہ تیس سال بعد پھر جاگ اٹھا............ادارہ کے ریکارڈ میں تو اس نمبر کی سی ڈی آر گمشدہ درج تھیں............ابتدائی چھان بین کے بعد ہی واضح ہو گیا کہ یہ سی ڈی آرز نوید عالم ریٹائرڈ ڈائریکٹر نے اپنی تعیناتی کے دوران اس وقت غائب کی تھیں، جب وہ ادارہ میں کلرک تھے............

چنانچہ پہلے ہی مرحلے پر نوید عالم کو گرفتار کر لیا گیا............جس نے ابتدائی تفتیش کے بعد اقرار جرم کر لیا............نوید عالم کے ڈاکٹر اور تحصیلدار بیٹے شرمندگی اور ندامت کی وجہ سے اپنے احباب و اقارب میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہے کہ ان کا باپ غبن کے الزام میں گرفتار ہے............رشوت کی کمائی سے پرورش پانے والے ان بیٹوں نے اپنے تبادلے دوسرے اضلاع میں کروا دیئے اور اپنے کرپٹ، ضعیف العمر باپ کو

جیل میں بے یارو مددگار چھوڑ کر آنکھیں پھیر لیں۔

پینتیس برس بعد سلیم بابر کو بے گناہ قرار دے کر پوری مراعات کے ساتھ ان کی پنشن کا کیس تیار ہوا اور سلیم بابر کے نام بارہ لاکھ روپے پنشن کمیوٹ کے چیک کا اجراء کر دیا گیا ....لیکن سلیم بابر کا کوئی اتا پتا معلوم نہ ہو رہا تھا............ بہت تلاش و بسیار کے بعد معلوم ہوا کہ سلیم بابر شہر کے ایک مضافاتی قصبہ میں کرایہ کے مکان میں رہتے تھے۔ ایڈریس معلوم ہونے پر ادارے کا پیادہ کو متعلقہ مقام پر بھیجا گیا............ پیادہ پوچھتا پاچھتا آخر کار اس مکان پر جا پہنچا جہاں سلیم بابر نے اٹھارہ بیس برس کرایہ کے مکان میں گزارے تھے............لیکن وہاں اس مکان میں سلیم بابر کے خاندان کا کوئی فرد نہیں تھا............ یہاں محلّہ کے مقامی لوگ انہیں ''گاؤں والے بابو'' کے نام سے جانتے اور پہچانتے تھے.................. سلیم بابر کے مکان کے مکینوں نے بتایا کہ انہوں نے دو ہی برس پہلے یہ مکان خریدا ہے اور اس مکان میں رہنے والے سلیم بابر اور ان کی بیوی کوئی تین سال پہلے فوت ہو گئے تھے............اور محلے کے حاجی ذکاء اللہ صاحب کے مشورہ پر اہل محلّہ نے دونوں میاں بیوی کی قبریں حاجی ذکاء اللہ صاحب کی زمین میں ڈال دیں............ پیادہ نے صورت حال معلوم ہونے پر قبرستان میں جا کر دونوں کی قبریں دیکھیں اور سلیم بابر کی فوتگی کی گواہی محلّہ کے دو معمر افراد سے دفتر کی فائل پر ڈلوا کر لے آیا۔

پنشن برانچ کے کلرک نے پیادہ کے دیئے گئے کاغذات وصول پا کر سلیم بابر کی پنشن فائل پر مختصر نوٹ لکھا:

''دفتر کا پیادہ میر زمان سلیم بابر کی جائے رہائش پر بھیجا گیا، سلیم بابر وفات پا چکے ہیں، ان کی بیوی ان سے پہلے وفات پا گئی تھی اور ان کے بیٹوں کے بارہ میں کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ کہاں ہیں۔ ان کا نام ادارہ کی معیت سے خارج کیے جانے کی منظوری کے علاوہ ان کی پنشن کا بارہ لاکھ روپے کا چیک ادارہ کے اکاؤنٹ میں جمع کروانے کی اصولی منظوری حاصل کی جائے.............. کاغذات پیادہ بر صفحہ 113 تا 117 خ ک شامل مسل ہیں''۔ برائے ملاحظہ و مناسب حکم مسل پیش خدمت ہے۔

جناب ہیڈ کلرک　　　　دستخط کلرک

گندم

مکافات عمل کے تحت ظالم بوڑھا نمبردار
بیماری کی حالت میں نشان عبرت بنا اور
دن بھر تنہا پڑا کھانستا رہتا ہے، جسے آنکھ اٹھا
کر بھی کوئی نہیں دیکھتا اور تا باں پیر............

میرے گھر کے ساتھ ہی وسیع سرکاری زمین ہے، جسے گاؤں کے لوگ ''کانچرائی'' کہتے ہیں۔ یہ بہت بڑا رقبہ تھا، مگر اب آدھے سے بھی کم رہ گیا ہے۔ گاؤں کے لوگوں نے نمبردار سے پروانہ منظوری حاصل کر کے آہستہ آہستہ اس رقبہ کے مختلف حصوں پر قبضہ کر کے اس کو آباد کر لیا ہے۔ کہیں مکان بن گئے ہیں اور کہیں درخت لگا دیئے گئے ہیں اور کہیں گھاس اگتی ہے، جسے ہر سال اسوج کے مہینے یہ لوگ کاٹ لیتے ہیں۔ سب کو پتہ ہے اور گاؤں کے سارے لوگ جانتے ہیں کہ یہ ''کانچرائی'' سرکاری رقبہ ہے، جس پر وہ ناجائز قابض ہیں، لیکن اگر کوئی دوسرے سے کہہ دے کہ تو سرکاری رقبہ پر قابض ہے تو طوفان اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ سب کہنے والے کو کوستے ہیں اور برا بھلا کہتے ہیں، تو وہ مارے خوف کے گاؤں کے کسی فرد کے سامنے اس حقیقت کا تذکرہ نہیں کرتا .... ہاں گھروں میں گاؤں کے بے نوا لوگ جو کانچرائی پر قابض نہیں ہیں، اپنے دل کی خوب بھڑاس نکال لیتے ہیں، مگر پھر بھی ان کے دلوں میں ڈر اور خوف دبکا رہتا ہے............ میرا یہ گاؤں بلند پہاڑی کی ایک ڈھلوان پر واقع ہے۔ ایک طرف زرخیز کھیت ہیں، جہاں گندم، جو اور مکئی کی فصلیں اور دیگر سبزیاں کاشت کی جاتی ہیں اور دوسری طرف پتھریلی سنگلاخ زمین .... مگر یہ زمین بھی سونا اگلتی ہے۔ جہاں چیڑھ، کائل اور کیکر کے درختوں کا گھنا جنگل ہے۔ جس جگہ جنگل نہیں وہاں سنبل، جنڈھ، کھکھر اور چھبے کی گھنی جھاڑیاں ہیں اور گھاس ہے۔ ان جگہوں پر گاؤں کے لوگ مویشی چراتے ہیں اور یہی رقبہ کانچرائی ہے۔

لوگوں نے کانچرائی پرتھوڑا تھوڑا کر کے قبضہ کیا............ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں چھوٹا سا تھا، تو اماں کے ساتھ کانچرائی میں جاتا رہتا تھا۔ہم لوگ جھاڑیوں کی موٹی موٹی جڑیں اکھاڑ کر جلانے کے لیے لاتے تھے۔مگر ہر برس اماں مجھے بتاتیں کہ

''سندھلو! جہاں سے ہم نے گزشتہ برس جڑیں اکھاڑی تھیں، اس جگہ پر توبُو دے نے قبضہ کرلیا ہے اور جھاڑیاں اکھاڑ کر کھیت بنالیا ہے۔اس طرح ہر سال تھوڑا تھوڑا کر کے لوگ اپنی زمین کی ملکیتی حدود میں توسیع کر لیتے تھے................ میں اماں سے کہتا کہ'' گاؤں کے لوگ اگر اس طرح کانچرائی پر قبضہ کرتے رہے تو کانچرائی (سرکاری رقبہ) ختم ہو جائے گی اور ہم لوگ اپنے مویشی کہاں چرائیں گے؟ جلانے کے لیے سوکھی جھاڑیاں اور ان کی سوکھی جڑیں کہاں سے کھاڑیں گے؟..........''۔اماں میری باتوں کا سوائے اس کے کچھ جواب نہ دیتیں کہ''اللہ مالک ہے''۔

ایک دن اماں نے صبح مجھے دو پراٹھے پکا کر دیئے اور کہا'' آج تو میرے ساتھ مویشی چرانے جائے گا۔خوب پیٹ بھر کر ناشتہ کر لے..........دوپہر ہم نے ادھر ہی چراگاہ میں گزارنی ہے۔مویشی بھوکے ہیں۔ دن ڈھلے واپس لوٹیں گے''۔

میں خوب ناشتہ کر کے اماں کے ساتھ مویشی چرانے کانچرائی میں چلا گیا۔ہماری تین گائیں تھیں۔دو بکریاں اور ایک بیل................ہم مویشی چراتے چراتے تھوڑا آگے نکل گئے۔ اماں میرے ساتھ تھیں، جہاں کہیں انہیں سوکھی جھاڑی نظر آتی، درانتی سے کاٹ لیتیں۔انہوں نے چادر کی بکل مار رکھی تھی اور درانتی ان کے کندھے کے ساتھ لٹکی ہوئی تھی۔ایک جگہ انہیں وافر سوکھی جھاڑیاں نظر آ گئیں، جن کو کاٹنے میں کچھ وقت لگ گیا۔اس دوران ہمارے مویشی آگے بڑھ گئے تو اچانک نکڑ پر بسنے والا لڑکا ظرفو زور سے پکارا..........''نکالو یہاں سے مویشی................ یہ کس کے مویشی ہیں؟''

اماں نے اس کی پکار سن کر کہا۔

''ہر سال یہاں مویشی چرتے تھے..........اب کیوں نکالوں؟

''زیادہ باتیں نہ کر..........مویشی نکال یہاں سے.......... یہ اب ہماری جگہ ہے''

ظرفو کا لہجہ نہایت گستاخانہ تھا۔

اماں بولیں''میں عورت ہوں..........تو ہی مویشی واپس ہانک دے''

لڑکا پھر غصہ سے بولا................''کھنی کھا کر کھنی پر نوکر رکھ لے''

یعنی آدھی روٹی کھا کر آدھی پر ملازم رکھ لے میں کیوں مویشی ہانکوں..........؟اماں کی پیشانی پر تاسف اور پریشانی سے بل پڑ گئے اور انہوں نے حیرانگی سے کہا۔

''تو ہے کتنا اک................ باتیں کیسی کر رہا ہے!؟''۔لڑکا جو آمادہ فساد تھا، بولا۔

''آ کر کھینچ کر بڑا کر دے''

اماں نے پھر کچھ نہ کہا اور مویشی ہانک کر لے آئیں۔تب مجھے معلوم ہوا کہ ظرفو نے سرکاری زمین کے اس حصے پر قبضہ کرلیا ہے۔اسی لیے وہ ہمیں مویشی چرانے سے منع کر رہا ہے................

ہمارے گاؤں کے غریب، مفلس اور نادار، بے نوا لوگوں کی زندگی بڑی ہی دردناک اور مشقت بھری ہے۔زندگی بھر کی جفائیں اور قضیے ان کا مقدر ہیں۔گاؤں کے کھڑپینچوں اور نمبردار کی مرضی کے سوا وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔انہیں سب کو نہ صرف راضی رکھنا پڑتا ہے، بلکہ ان کی بیگاریں بھی بھگتنی پڑتی ہیں......................۔

جب میں چھٹی جماعت میں داخل ہوا تو مجھے گاؤں کا پرائمری سکول چھوڑ کر دوسرے گاؤں کے مڈل سکول میں جانا پڑا۔ہمارے گاؤں کے نمبردار کے لڑکوں کے علاوہ میں واحد لڑکا تھا جس نے مڈل سکول میں داخلہ لیا تھا۔گاؤں کے لڑکے چوتھی یا پانچویں سے زیادہ نہیں پڑھ پائے تھے۔چار یا پانچ جماعتیں تعلیم پانے کے بعد ان لڑکوں کو کام پر لگا دیا جاتا۔وہ بھینسوں اور بیلوں کے لیے چارا کاٹ کر لاتے، کھیتوں میں بوائی کرتے اور جب مکئی کے پودے فٹ ڈیڑھ فٹ بڑھ جاتے تو ان لڑکوں کے تائے، چاچے اور والدین ان کو مکئی کی گوڈی پر لگا دیتے۔لڑکے ٹولیوں کی شکل میں مئی کی گوڈی کرتے۔

ایک سال رمضان کا مہینہ شدید گرمیوں میں آیا۔نواں روزہ تھا، میں نے اماں کے منع کرنے کے باوجود سحری کھا کر روزہ رکھ لیا۔دن کو پیاس نے بہت ستایا۔سکول سے واپسی پر ہم لڑکے راستے میں چشمے پر نہائے تو میری پیاس کچھ کم ہوئی۔افطاری کے لیے اماں ایک جڑی جسے وہ''تَسھی'' کہتی تھی، کوٹ کر رکھتی تھیں۔اس جڑی کا وہ گڑھ ڈال کر کر شربت بناتی تھیں۔جسے پیتے ہی دن بھر کی ساری پیاس بجھ جاتی.......... یہ گرم دن میں نے بہت

مشکل سے گزارا............ان دنوں میرے چچا''شالو'' بھی گھر پر تھے۔وہ چار ماہ بعد جنگلات کے ٹھیکیدار کے ساتھ مزدوری سے واپس لوٹے تھے۔سورج کی کرنوں نے جب پہاڑوں کی چوٹیوں پر زردی بکھیرنا شروع کی تو اماں پریشانی سے بولیں۔

''کھانا اور افطاری تیار ہے،شالو ابھی تک واپس نہیں آیا''

میں نے اماں سے پوچھا۔

''شالو چاچا کہاں گئے ہوئے ہیں؟''...............

اماں نے جواب دیا............''جرگہ تھا............جرگہ میں گئے ہوئے ہیں''..................''کس بات کا جرگہ''میں بولا..................

''ارے! تجھے نہیں معلوم،سال بھر پہلے تیرے چاچا کا بیاہ ہوا تھا............تیرے چاچا نے اپنا بیل گروی رکھ کر قرضہ لیا تھا۔سارا قرضہ چکا دیا مگر بیل واپس نہیں مل رہا''۔

اماں کے بتانے پر مجھے یاد پڑا کہ چاچا جب بیل لے کر جا رہے تھے تو میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے تھے۔بیل جاتے ہوئے مڑ مڑ کر مجھے دیکھ رہا تھا............مگر چاچا اسے لے کر چلے گئے تھے۔

مجھے کئی دنوں تک بیل کا دکھ اور افسوس رہا،لیکن چاچا نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا تھا کہ وہ جلد بیل واپس لے آئیں گے۔چاچا نے نمبردار کے ہاں بیل گروی رکھوا کر قرضہ لیا تھا۔اماں نے مجھے بتایا کہ:

''نمبردار اب بیل واپس نہیں کر رہا،کہتا ہے کہ شالو نے وعدہ کے برعکس دس دن بعد رقم واپس کی ہے............اب بیل اسے واپس نہیں مل سکتا''

دس دن تو کچھ زیادہ عرصہ نہیں..................چاچا کام پر تھے۔کئی ماہ بعد واپس آئے ہیں۔چند دن اوپر نیچے ہو ہی جاتے ہیں''۔میں نے کہا۔

''یہ بات نمبردار نہیں مانتا............اسے تو عذر چاہیے تھا۔اب نمبردار کا مطالبہ ہے کہ دگنی رقم واپس دو،تب بیل ملے گا۔اب فصل بوائی اور زمین پر ہل جوتنے کے دن سر پر آ گئے ہیں۔اگر نمبردار نے بیل واپس نہ کیا تو ہم فصل کیسے کاشت کر پائیں گے۔ہمارے پاس تو ایک ہی بیل رہ گیا ہے''۔

اماں کا لہجہ انتہائی رنجیدہ تھا۔

جب چاچا رات گئے واپس آئے تو اماں نے ان سے پوچھا کہ''جرگہ

میں کیا فیصلہ ہوا؟''

چاچا جو بجھے بجھے سے لگ رہے تھے،مریل سی آواز میں بولے۔

''صبح کا نمبردار نے کہا ہے کہ آ کر بیل لے جانا''۔

''خدا کا شکر ہے''۔اماں نے بے ساختہ کہا۔

''لیکن نمبردار کو بیل واپس کرنے پر آمادہ کروانے کی بھی مجھے قیمت چکانا ہو گی............وہ ہے نا............تاباں پیر،اس کو بھی نذرانہ دینی ہے۔وہ جرگہ میں میرے حق اور تائید میں جو بولا تھا''

''کیا خدا واسطے حق،سچ بات کہنے والا اس گاؤں میں کوئی نہیں رہا''۔اماں دہائی دے کر بولیں..................''

حق سچ کہنے والے لوگ ہیں............لیکن وہ نمبردار کے سامنے بول نہیں سکتے............اسی لیے میں نے تاباں پیر کی منت کی تھی۔میں نے سوچا تھا کہ پانچ وقتی نمازی ہیں............میری تائید و حمایت میں انہوں نے بات کی، مگر پیشگی نذرانہ بھی مانگ لیا''۔چاچا نے افسردگی سے کہا۔

''کیا نذرانہ؟''اماں نے پوچھا..................

''ایک جوڑا نیا سوٹ جو وہ پسند کریں گے یا پھر دو ہزار روپے نقد اور ایک بکری''۔چاچا نے بتایا۔

''اف خدایا............!اب پیر بھی سچ بات کہنے کا معاوضہ لینے لگ گئے۔آخر ہم لوگ کہاں جائیں؟............کہاں بھاگیں؟؟''۔

چاچا نے کہا..................''ہم لوگ اتنے صاحبِ نصیب کہاں!کہ یہاں سے چلے جائیں۔ ہمارے پرکھوں کی قبریں یہاں،زمین یہاں،رشتے دار یہاں،پڑوسی یہاں،صدیوں سے اس ہی گاؤں میں بستے ہیں............بھلا کہاں جائیں؟اور جا کر کہاں سر چھپائیں۔ہم گاؤں کے غریب اور مزدور لوگ شہروں میں جا کر بسنے سے تو رہے..................شہروں کی فضائیں تاباں پیر کو راس آ سکتی ہیں............نمبردار کے بیٹوں کو راس آ سکتی ہیں............ہماری یہ اوقات تو نہیں''

چاچا کا جواب پا کر اماں ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر منہ بسورنے لگیں۔

..................اس دن رات بھر میں چاچا کی باتوں پر سوچتا رہا۔تاباں پیر اکثر ہمارے گھر آتے رہتے تھے۔جن کی خوب خاطر مدارت کی جاتی تھی..................وہ بہت لمبی نمازیں پڑھتے تھے۔

ایک دن انہوں نے رات کا کھانا ہمارے ہاں کھایا تھا۔لیکن تقریباً

آدھی رات کے وقت..........کھانا تیار تھا، لیکن تاباں پیر نے کہا کہ پہلے ذرا نماز پڑھ لوں، پھر کھانا کھاؤں گا..........وہ نماز پڑھنے کیا گئے، عشاء کی نماز پر پورے اڑھائی گھنٹے لگا دیئے۔ کم از کم ایک گھنٹہ کی انہوں نے طویل دعا مانگی..........میں سمجھتا تھا کہ ہمارے گاؤں کے سب سے نیک اور سب سے پرہیزگار آدمی تاباں پیر ہیں۔ لیکن چاچا شالو کی باتوں نے میرے اس تاثر اور یقین کو ملیا میٹ کر دیا تھا۔ میں بہت سوچتا رہا، بہت غور کرتا رہا کہ تاباں پیر ایسے بھی ہو سکتے ہیں کہ حق اور سچ بات کہنے کا معاوضہ لیں گے، لیکن چاچا کے بقول انہوں نے معاوضہ چاچا کے حق میں بات کرنے سے پہلے ہی طے کر دیا تھا۔ اس دن کے بعد میری عقیدت تاباں پیر سے ختم ہو گئی۔ اگر وہ میرے راستے میں آجاتے تو میں راستہ بدل لیتا یا الٹے پاؤں واپس پھر جاتا..........۔

صبح ناشتہ کے بعد شالو چاچا نے مجھے کہا کہ ”بکری کھول کر گلے سے باندھ کر لے آ..........میں تاباں پیر کے ہاں جاؤں گا“..........میں نے انہیں بکری کھول کر لا دی..........چاچا بکری لے کر تاباں پیر کے ہاں چلے گئے اور میں نے بستہ اٹھا کر اپنے سکول کی راہ لی۔

سہ پہر کو جب میں سکول سے واپس آیا تو میں نے دیکھا کہ مویشیوں کے باڑہ میں دو بیل بندھے ہوئے ہیں۔ چاچا نمبردار سے اپنا بیل لے آئے تھے۔ بیل نے مجھے دیکھتے ہی بولنا شروع کر دیا۔ بیل یقیناً مجھے بلا رہا تھا۔ پورے ایک سال بعد بھی اس نے نے مجھے پہچان لیا تھا۔ یہ بیل چھوٹا سا بچہ تھا، جب میں اس کو پکڑ کر اس کا منہ گائے کے تھنوں سے لگاتا تھا۔ میں بھی اس کی ماں کا دودھ پیتا تھا..........پھر یہ دیکھتے ہیں دیکھتے بچے سے بڑا ہو کر بیل بن گیا تھا۔ جب پہلی بار اسے ہل میں جوت کر کھولا گیا تو وہ دوڑ کر میرے پاس آیا تھا۔ اسے شدید شکایت تھی کہ اسے ہل میں کیوں جوتا گیا..........میں اس کا گال کھجلاتا رہا..........پھر جب میں نے اس کا گال کھجلانا ختم کیا تو وہ میرے سر کے بال چاٹنے لگا..........وہ اپنی محبت کا اظہار کر رہا تھا۔ میں اس بیل کو گھر میں دیکھ کر بہت خوش ہوا اور بستہ خوبانی کی ٹہنی سے لٹکا کر سیدھا بیل کے پاس جا بیٹھا..........اس نے پہلے اپنے نتھنوں سے مجھے سونگھا اور پھر اپنی آنکھیں بند کر لیں اور جب آنکھیں کھولیں تو ٹپ ٹپ اس کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے

..........میں نے اس کا گال کھجلانا چاہا، لیکن بیل نے زور سے سر ہلا کر گویا مجھے منع کر دیا۔ میں خاموش ہو گیا تو بیل اپنی زبان سے میرا سر چاٹنے لگا۔ یقیناً بیل شکوہ کر رہا تھا کہ میں نے اسے کیوں جدا کیے رکھا؟ وہ میرا اس وقت ہی دوست بن گیا تھا، جب وہ پیدا ہوا تھا۔ وہ پھر بھی مجھ سے ناراض نہیں تھا۔ اسے دکھ تھا کہ ہم نے اسے نمبردار کے ہاں کیوں بھیج دیا تھا۔ اس دکھ کے سبب وہ رویا بھی تھا۔ میں اس وقت تک بیل کے پاس بیٹھا رہا جب تک اماں نے نظر پڑنے پر مجھے اندر نہ بلا لیا۔

دوسرے دن میں اماں کے ساتھ چراگاہ میں چلا گیا۔ ہماری جلانے کی لکڑیاں ختم ہو گئی تھیں۔ اماں کے پاس درانتی اور رسیاں تھی۔ ہم نے چراگاہ یعنی سرکاری زمین پر جا کر جائزہ لیا اور لکڑیوں کے حصول کے لیے گھنی جھاڑیاں منتخب کیں۔ جن کے درمیان سے راستہ گزرتا تھا۔ میں اماں کے ساتھ سوکھی جھاڑیاں چنتا رہا جبکہ اماں درانتی سے سوکھی جھاڑیاں کاٹ رہی تھیں۔ پھر میں لکڑیاں چنتے چنتے اماں سے کافی دور چلا گیا۔ کچھ ہی وقت گزرا تھا کہ میں نے دور سے دیکھا کہ ایک فوجی وردی پہنے اماں کی طرف آرہا ہے..........جب وہ اماں کے پاس پہنچا تو اماں نے درانتی ایک طرف رکھ دی اور فوجی کے پاس کھڑی ہو کر ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگیں۔ فوجی نے ٹوپی بھی پہن رکھی تھی۔ پھر اماں اور فوجی دونوں بیٹھ گئے..........میں حیران ہوا کہ اماں فوجی کے پاس بیٹھ کیوں گئی ہیں..........آخر فوجی کون ہے؟..........فوجی کے ہاتھ میں بڑا سا تھیلا تھا۔ اس نے تھیلے سے سرخ سرخ بڑے گیند نما دانے نکالے اور اماں کو دیئے۔ اماں ان دانوں کو توڑ کر کھانے لگیں..........اماں نے ہاتھ کا اشارہ کر کے مجھے اپنے پاس بلایا..........
میں تذبذب کی حالت میں اماں کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ اماں کے پاس فوجی نہیں بلکہ میرے ابا بیٹھے ہوئے تھے۔ انہیں فوجی وردی میں، میں نے پہلی بار دیکھا تھا اور پہچان نہ پایا تھا۔ فوجی وردی میں وہ بہت بارعب لگ رہے تھے۔ قریب پہنچنے پر انہوں نے میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور ایک سرخ دانہ تھیلے سے نکال کر مجھے دیتے ہوئے کہا کہ اسے توڑ کر کھا..........میں نے دانہ کا چھلکا توڑا تو اس میں بالکل سرخ موتیوں کی طرح چھوٹے چھوٹے رس بھرے دانے تھے..........
میں نے کچھ نکال کر کھائے تو اماں سے پوچھا یہ کیا چیز ہے؟..........اماں ہاتھ اٹھا کر ابا سے مخاطب ہوتے ہوئے بولیں۔

"ارے سندلہو کو یہ بھی پتہ نہیں کہ کیا کھا رہا ہے۔ پھر اماں نے مجھ سے پوچھا۔

"یہ چیز تو نے پہلے نہیں کھائی؟"

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اماں بولیں..........

"ارے..........یہ انار ہے..........انار.........پھر ابا سے کہنے لگیں۔

"اس نے انار اس سے پہلے کبھی نہیں کھایا...............انار کو پہچان ہی نہیں رہا................"

ابا نے مجھے ایک اور دانہ تھیلے سے نکال کر دیا...............اماں جو ابا کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں، نے مجھے کہا "کہ چنی ہوئی سوکھی لکڑیاں ایک جگہ اکٹھی کر"..................۔

میں نے جھاڑیاں اکٹھی کر دیں..............اماں نے انہیں رسی سے باندھ کر پروہٹی (گٹھا) بنائی اور سر پر اٹھالی اور پھر میں ابا اور اماں گھر آ گئے۔

ابا دو ماہ کی چھٹی پر گھر آئے تھے۔ ابا کی آمد پر چاچا بھی بہت خوش ہو گئے۔ گندم کی فصل کو تیار ہونے میں کچھ ہی دن باقی تھے۔ جب گندم پک کر تیار ہو گئی تو ابا، چاچا اور اماں کئی دنوں تک گندم کاٹتے رہے۔ چاچی نے کھانا پکانا اور گھر کی دیگر ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ ابا نے شاید گندم کٹوائی کے دنوں میں ہی چھٹی منظور کروائی تھی.............پھر وہ دن بھی آیا جب ہمارے کھیت کے کھلاڑے میں گندم کا بڑا سا ڈھیر لگ گیا۔ اس ڈھیر کو دیکھ کر ابا اور چاچا خوش ہوتے اور آپس میں باتیں کرتے ہوئے اندازہ لگاتے کہ گندم کی مقدار کتنی ہوگی؟ ایک دن دونوں "مچھے" سے گندم کی دھول اڑا کر کھلاڑے میں بیٹھے ہوئے تھے تو چاچا نے گندم کے ڈھیر پر اچٹتی سی نگاہ ڈالتے ہوئے کہا..............

"ڈیڑھ سو من سے کچھ زیادہ ہی گندم ہوگی.............." ابا بولے۔

"ارے کمال کرتے ہو۔ دو سو من سے کچھ اوپر ہی ہوگی...............اس بار گندم یہاں فروخت نہیں کریں گے بلکہ میں خود شہر جا کر بیچوں گا"..............

"پھر تو نمبر دار ناراض ہو جائے گا.................آپ کو پتہ ہے نا..............کہ سب گاؤں والوں سے گندم نمبر دار ہی خریدتا ہے اور پھر ٹرکوں پر لاد کر خود شہر میں جا کر بیچتا ہے" چاچا مشورے کے انداز میں بولے۔

"نمبر دار ظالم ہے...............وہ ہم سے آدھی قیمت میں گندم خریدتا

ہے اور دگنی قیمت پر جا کر بیچتا ہے...............میں نے خود شہر میں ایک بیوپاری سے بات کر رکھی ہے۔ میں خود شہر لے جا کر گندم بیچوں گا۔ اس بار نمبر دار کو گندم نہیں دیتے۔ نمبر دار کیا کر لے گا" ابا نے کہا۔

"وہ تو لاکھوں روپے بچا لیتا ہے ہر سال۔ پچھلے سال پچاس ٹرک نمبر دار نے شہر میں جا کر بیچے تھے اور گاؤں والے کہتے ہیں کہ ہم کو نمبر دار نے آدھی قیمت بھی نہیں دی..............لیکن نمبر دار کی خفگی مول لینا بھی خطرناک ہے" چاچا نے خدشہ کا اظہار کیا۔

"نمبر دار ایسا کچھ نہیں کر سکتا۔ ہم اپنی ملکیتی زمین اور اپنے گھر میں رہتے ہیں۔ نمبر دار کا خدشہ دل سے نکال دو.............نمبر دار ہمارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔ اس بار میں خود گندم شہر میں جا کر فروخت کروں گا"

ابا کی وضاحت پر چاچا نے بھی رضامندی کا اظہار کر دیا۔

...............جمعرات کے دن علی الصبح ابا نے گندم کا ٹرک لادا اور میرے سکول جانے سے پہلے وہ گندم فروخت کرنے کے لیے شہر چلے گئے.............ابا دوسرے دن شام کو گھر آئے تو انہوں نے بتایا کہ "گندم اس نرخ سے دگنی قیمت پر فروخت ہوئی ہے، جو نمبر دار نے گاؤں میں مقرر کر رکھا ہے"۔ چاچا یہ سن کر بہت خوش ہو گئے۔ اماں، چاچی بھی پاس ہی چارپائی پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ ابا نے آدھی رقم گن کر چاچا کو دی اور پھر کہا کہ "آئندہ ہمیشہ شہر جا کر گندم فروخت کرنا..............میں تمہارا نام دے آیا ہوں کہ فلاں شخص گندم لائے گا۔ مجھے شاید چھٹی نہ مل سکے"۔ چاچا نے ہامی بھر لی۔ چاچی اٹھ کر مٹی کے برتن میں ٹھنڈی لسی لے آئیں اور پھر ہم سب خوشی خوشی لسی پینے لگے۔

اگلی صبح بمشکل سورج طلوع ہوا تھا کہ تاباں پیر، قیصو، نمبر دار کا بیٹا نواست اور فضل احمد ہمارے گھر آ گئے۔ ابا نے انہیں صحن میں بچھی بان کی چارپائیوں پر بٹھایا۔ میں اندر کمرے میں چائے کے ساتھ مکھن میں پکا پراٹھا کھا رہا تھا۔ تاباں پیر کی گونجدار آواز اندر بھی پہنچ رہی تھی۔ وہ ابا پر برس رہے تھے۔

"یہ تو نے کیا کر دیا...............آخر نمبر دار کا بھی کچھ مقام اور عزت ہے۔ سب گاؤں والوں سے نرالا کام تو نے کیا ہے۔ سب برضا و رغبت نمبر دار کو گندم فروخت کرتے ہیں اور تو اٹھا، گندم شہر میں جا کر بیچ دی۔

نمبردار صاحب سخت ناراض ہیں۔ تجھے کچھ شکوہ شکایت تھی، مجھ سے بات کرتا............فضلو سے بات کرتا۔ براہ راست نمبردار صاحب کے ہاں چلا جاتا۔ کیا وہ تیری بات نہ سنتے!!............... ہمارے نمبردار عام نمبردار نہیں ہیں۔ انہیں سب کے دکھ درد کا احساس ہے۔ سب کے ہمدرد ہیں سب کے خیر خواہ ہیں۔ وہ گاؤں والوں کے بھلے کی خاطر ہی ساری گندم اکھٹی کروا کر شہر لے جاتے ہیں..............سب کو جنجال میں نہیں ڈالتے۔ اس طرح اچھی رقم مل جاتی ہے۔ گاؤں کے لوگوں کی دیہاڑاں بھی ضائع نہیں ہوتیں۔ لیکن ایسی گستاخیاں! خدا کی پناہ۔ ابھی پچھلے ماہ کی بات ہے میں نے تیری غیر موجودگی میں تیرے بھائی کو نمبردار صاحب سے بیل واپس دلایا۔ تجھے کیا معلوم مجھے بیل کے لیے کیا پاپڑ بیلنے پڑے............نمبردار صاحب کا یہ اصول ہے پکا ....کہ گروی رکھی ہوئی چیز تب واپس کرتے ہیں جب دی گئی تاریخ پر انہیں رقم لوٹائی جائے۔ تیرے بھائی نے دس دن تاخیر سے پیسے واپس لوٹائے تھے۔ یہ میری ہمت سمجھ کہ نمبردار صاحب سے بیل واپس لایا ہوں۔ اس کے لیے نمبردار صاحب کو زندگی بھر کا اصول توڑنا پڑا اور انہوں نے میری لاج رکھ لی........... مجھے اب معلوم ہوا ہے کہ گاؤں والے سچ کہتے ہیں کہ کریم خان کے بیٹے خطرناک ہیں۔ سانپ کی طرح ڈنک مارتے ہیں۔ آپ لوگوں نے میرا بھی خیال نہ کیا کہ ناراض ہو جائے گا۔ جگہ جگہ تمہاری تائید وحمایت میں بولتے بولتے میری زبان تھک گئی ہے۔ اور آپ لوگوں نے اپنی گندم شہر میں جا کر فروخت کر دی۔ مجھے بھی نہ پوچھا..............حد ہی کر دی..............کیا فائدہ دو چار پیسے زیادہ لے لیے لیکن سارے گاؤں کو ناراض کر دیا"۔

میں تاباں پیر کی تیز اور غصیلی آواز سن کر آدھا پراٹھا چھوڑ کر برآمدے میں آ گیا۔ ابا کا چہرہ غصے سے لال بھبھوکا ہو رہا تھا، مگر وہ بالکل خاموش تھے۔ چاچا بھی ایک طرف اضطراب کی حالت میں کھڑے تھے..............تاباں پیر نے ہاتھ اٹھا کر تنبیہ کے انداز میں کہا۔ "آئندہ میرا اور تمہارا تعلق ختم..............."

چاچا زیرلب آہستہ سے بولے "خدا کا شکر ہے"۔

چند لمحے توقف کے بعد تاباں پیر دوبارہ گویا ہوئے..............."اپنے نفع ونقصان کے تم لوگ خود ذمہ دار ہو گے.............. میری ناک تو آپ لوگوں نے کٹوا دی..............کسی نے سچ کہا ہے۔ "نیچاں دی آشنائی کولوں فیض کسے نہ پایا"..............اٹھو ....چلو یہاں سے"..............اپنے دل کا غبار ہلکا کر کے جب تاباں پیر اپنے عقیدت مندوں کے ہمراہ چلے گئے تو چاچا نے ابا سے پوچھا۔ اب کیا بنے گا؟..............ابا بولے "کچھ نہیں ہوگا۔ ان لوگوں کو یوں ہی باتیں کرنے دے۔ ہم ہر سال گندم شہر میں ہی لے جا کر فروخت کریں گے اور نمبردار وتاباں پیر کی گرفت ٹوٹ جائے گی۔ یہ تو لوگوں ک خون نچوڑتے ہیں۔ ان کی محنت کا صلہ کھاتے ہیں۔ بھلا ہم مارکیٹ ریٹ سے کم قیمت پر گندم کیوں فروخت کریں؟"

چاچا کو سمجھا بجھا کر ابا نے ان کا خدشہ دور کر دیا..........لیکن یہ کسی کو معلوم نہ تھا کہ نمبردار درپردہ یوں علی الاعلان شہر میں لے جا کر گندم فروخت کرنے کی جسارت کا انتقام لینے پر تلا بیٹھا ہے۔

...............ابا کی چھٹیوں کا ایک ہفتہ باقی تھا کہ چاچا نے گھر آ کر ابا کو خبر دی کہ ہمارے کھیتوں پر نمبردار، تاباں پیر، پٹواری، گرداور کے ہمراہ ناپ تول کر رہے ہیں۔ ابا جو بیٹھے گھاس کے جوتے بنا رہے تھے، وہیں چھوڑ کر بھاگے بھاگے چلے گئے۔ اماں اور چاچی گائیوں کا دودھ دوہنے مویشیوں کے باڑے میں گئی ہوئی تھیں..........میں چارپائی پر بیٹھا کاپی لکھ رہا تھا۔ میں نے کاپی وہیں چھوڑی اور ابا کے پیچھے چلا گیا۔ میں نے کھیتوں کے آخری سرے پر پہنچ کر دیکھا کہ گاؤں کے بہت سے لوگ جمع ہیں۔ تاباں پیر ہاتھ لہرا لہرا کا باتیں کر رہے تھے۔ نمبردار بھی لوگوں کو ہدایات دے رہے تھے۔ جب میں نے قریب پہنچ کر ان لوگوں کی باتیں سن کر سمجھیں تو معلوم ہوا کہ ہمارے کھیتوں کے سرے سرکاری اراضی، "کاہچرائی" پر واقع ہیں اور ہم کاہچرائی پر غیر قانونی قابض ہیں۔ ابا ان لوگوں کی باتوں کے بیچ میں بولے ....

"سارے گاؤں کے لوگ ہی کاہچرائی پر قابض ہیں۔ خود نمبردار صاحب نے سو کنال کے لگ بھگ سرکاری زمین پر قبضہ کر رکھا ہے اور تقریباً تین سو کنال کاہچرائی پر گاؤں والے قابض ہیں، لیکن قانون کی آنکھ کو صرف میرا ہی قبضہ نظر آتا ہے"...............

ابا کے استفسار پر گرداور صاحب بولے "شکایت صرف تمہارے نام ہوئی ہے، تمہارے خلاف درخواست دی گئی ہے۔ سرکاری زمین پر قبضہ تو سب نے کر رکھا ہے۔ لوگوں نے مکانات تک بنا لیے ہیں"۔

ابا نے جواب دیا "ٹھیک ہے..........میں سرکاری زمین پر قبضہ کر کے اپنی آخرت خراب نہیں کرنا چاہتا۔ یہ کھیت پرکھوں سے ہمارے چلے آ رہے ہیں..........یہ

بتاؤ کتنی جگہ پر ہم لوگ قابض ہیں؟''

گرداور صاحب نے کہا ''تقریباً چھ کنال پر............ہم نے ناپ تول کر لیا ہے''۔

''درست..................ان چھ کنالوں کی نشاندہی کر دو..........ہم یہ رقبہ چھوڑ دیتے ہیں۔'' ابا بولے۔

''آج تجھے آخرت کی فکر پڑ گئی ہے.................بڑی نیکی کی باتیں تجھے سوجھ رہی ہیں ....لیکن جہاں سے دو پیسے زیادہ ملیں، تجھے آخرت بھول جاتی ہے..........'' تاباں پیر نے ابا پر طنز کی۔

''پیر صاحب رہنے دیں اپنی نصیحتوں کو۔ ہم لوگ محنت کر کے گندم اگاتے ہیں اور مارکیٹ کے نرخ پر میں نے گندم فروخت کی ہے۔ بتایئے کیا برا کیا ہے؟''

''اب تجھے سمجھ آئی ہوگی کہ میں نے کیا غلط کیا ہے؟ اگر گندم شہر جا کر فروخت نہ کرتا تو تیری چھ کنال زمین محفوظ رہتی''۔ تاباں پیر نے ابا کو اشتعال دلانے کی کوشش کی۔

''نہیں پیر صاحب..................اگر زمین سرکاری ہے تو میں بھلا کیوں قبضے میں رکھوں۔''

...............ابا کی بات سن کر تاباں پیر لاجواب سے ہو گئے۔ نمبردار نے ہماری چھ کنال زمین جو کاہچرائی تھی یا نہیں الگ کروادی اور وہاں پر پتھر لگوا دیئے۔ ہماری زمین کی حدود چھ کنال سمٹ گئی تھی۔

گرداور صاحب جاتے وقت ہمارے گھر آئے۔ انہوں نے ابا کو رازدارانہ مشورہ دیا کہ:

''انہیں کاغذات کی چھان بین کے دوران معلوم ہوا ہے کہ لگ بھگ چار سو کنال سرکاری زمین یعنی کاہچرائی پر گاؤں کے لوگوں نے قبضہ کر رکھا ہے۔ آپ ان کے خلاف درخواست دیں تو کارروائی ہوگی اور میرا بھی دال دلیا نکل آئے گا''..................ابا بھانپ گئے کہ گرداور صاحب رقم کی لالچ کی خاطر یہ مشورہ دے رہے ہیں۔ ابا نے انہیں لسی پلائی اور سمجھا بجھا کر بھیج دیا کہ وہ کسی کے خلاف درخواستیں نہیں دیں گے۔ اگر آپ کو علم ہو گیا ہے کہ گاؤں والے سرکاری رقبہ پر قابض ہیں تو ان سے رقبہ چھڑوا لیں۔ بہت بعد میں انکشاف ہوا کہ نمبردار نے ہمیں ڈرانے اور ہراساں کرنے کے لیے پانچ ہزار روپے دے کر پٹواری اور گرداور کو بلایا تھا تا کہ ہم ڈر کر گندم نمبردار کے علاوہ کسی کو فروخت نہ کریں، لیکن ان کی یہ چال بھی بری طرح ناکام ہو گئی۔ ابا کی دیکھا

دیکھی عشرہ ڈیڑھ عشرہ میں تقریباً گاؤں کے سب لوگوں نے اپنی گندم مناسب داموں پر شہر میں جا کر آڑھتی کے ہاتھوں بیچنا شروع کر دی۔ نمبردار نے اپنی دھونس جمانے کی خاطر بہت واویلہ مچایا، لیکن گاؤں کے سب لوگ آہستہ آہستہ نمبردار کے چنگل سے آزاد ہوتے چلے گئے۔ ابا کی کوششوں سے رضا کارانہ طور پر لوگوں نے (کاہچرائی) سرکار رقبہ کا قبضہ چھوڑ دیا ہے۔ آج یہ حال ہے کہ نمبردار کا بیٹا چھکڑا چلا کر گھر کے اخراجات پورے کرتا ہے۔ نمبردار کی بوڑھی بیوی جسے نمبردار نے مار مار کر کبڑا کر دیا تھا، عرصہ ہوا وفات پا چکی ہے اور بیمار بوڑھا نمبردار دن بھر گھر میں چارپائی پر پڑا اونگھتا رہتا ہے، جس کو گاؤں کا کوئی فرد آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا اور تاباں پیر بے چارے تین چار برس ہوئے اپنے ہوش و حواس کھو چکے ہیں۔ کبھی کبھی وہ جاڑوں کی سخت سرد راتوں میں پچھلے پہر گھومنے گھامتے کسی مکان کے قریب سے گزرتے ہیں تو انہیں دیکھ کر کتے اتنے زور و شور سے بھونکنے لگتے ہیں کہ جیسے رات کے پر ہول سناٹے میں بھونچال آ گیا ہو۔ اس شور سے رات کی یخ سردی میں لحاف میں لپٹی جب کسی بڑھیا کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ اپنے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے دکھ و تاسف سے کہتی ہے ۔''بے چارا نصیبوں کا مارا تاباں پیر، رات رات بھر آوارہ پھرتا رہتا ہے۔ کم بخت سردی سے بیمار بھی نہیں پڑتا اور ہمیں بھی آرام سے سونے نہیں دیتا''۔

☆☆☆☆☆

پیالی پیر

قدرت کی گرفت ہمیشہ دبے پاؤں آتی ہے
اور آدمی کو اس طرح جکڑ لیتی ہے کہ
آدمی کو کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ آدمی کی
آنکھیں اس وقت کھلتی ہیں، جب وہ بند
گلی میں پہنچ جاتا ہے۔

بوڑھی زیب النساء سناٹے کے عالم میں اپنی جھونپڑی میں ستون کے ساتھ بچھے مصلےٰ پر بیٹھی زار و قطار رو رہی تھی۔ مغرب کا وقت گزر چکا تھا اور رات کی سیاہی اپنے پر پھیلائے ماحول کو اپنی گرفت میں لے رہی تھی۔ زیب النساء کا جھریوں بھرا چہرہ غم و اندوہ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کے لب ساکت تھے، مگر آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ فضا میں ملگجا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ جھونپڑی کے واحد دروازے کے پٹ ادھ کھلے تھے۔ جھونپڑی کے در و دیوار سے یاسیت و اداسی ٹپک رہی تھی۔ جھونپڑی سے باہر مٹی کے بنے ہوئے چولہے پر کالی بھجنگ دیگچی رکھی ہوئی تھی، جس کے نیچے گیلی لکڑیاں سلگ رہی تھیں، جن سے نکلنے والا دھواں مرغولے کھاتا ہوا فضاء میں بلند ہو رہا تھا۔ روتی ہوئی بڑھیا چند لمحے خاموش ہو کر ادھ کھلے دروازے کی طرف دیکھتی اور پھر ہچکیاں بھر کر رونے لگتی........... شاید بڑھیا کو کسی آنے والے کا انتظار تھا، جو ابھی تک نہیں آیا تھا........... بڑھیا کے دل میں طرح طرح کے اندیشے اور وسوسے سر ابھار رہے تھے........... وہ پچھلی رات سے بھوکی تھی، لیکن زندگی کے 80 سال گزارنے کے باوجود بڑھیا کے دل میں زندہ رہنے کی امنگ ختم نہ ہوئی تھی........... بڑھیا نے ایک بار نظریں بھر کر جھونپڑی کے ادھ کھلے دروازے کی طرف دیکھا اور پھر رو رو کر دعائیں مانگنے لگی۔

''اے اللہ! ہمیں معاف فرما دے........... اے اللہ ہم سے بڑی سخت خطا ہو گئی........... پیالی پیر تو پردہ کر گئے.................. یا اللہ! میں اپنا قصور اب کیسے معاف کرواؤں.................. اگر پیالی پیر زندہ ہوتے تو میں ہر روز سات مرتبہ ان کے پاؤں پڑ کر معافی مانگتی........... اے اللہ تو اپنی بے بہا رحیمی و کریمی کے طفیل مجھے بخش دے........... ہماری خطا کی سزا سے ہماری نسلوں کو محفوظ رکھ........... اے اللہ تو سب کا مولا ہے۔ سب کا مالک ہے۔ ہماری خطا پر اتنی سخت گرفت نہ کر...........''

بڑھیا کے الفاظ میں سوز بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کا لہجہ بھی بلند ہوتا جا رہا تھا........... کہ دفعتاً بڑھیا کو جھونپڑی کے باہر قدموں کی چاپ سنائی دینے لگی۔ بڑھیا نے رعشہ سے لرزتا اپنا سر گھما کر دروازے کی طرف دیکھا۔ دونوں ہاتھ منہ پر پھیر کر ''آمین'' کہا۔ مصلےٰ سمیٹا اور اٹھا کر بچھی چارپائی کے سرہانے رکھ دیا........... اور پھر دروازے سے باہر نکل آئی۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا........... جھونپڑی سے باہر نکلنے پر بڑھیا کی نظریں اپنے ''شاکو'' پر پڑیں جو پیالیوں کا تھیلا اٹھائے سیدھا اس کی طرف چلا آ رہا تھا۔ قریب پہنچنے پر شاکو پکار کر بولا...........
اماں!........... آج پیالی پیر کے مزار سے مجھے پوری اٹھارہ پیالیاں ملی ہیں.................. یہ نصیباں ماسی کو دے دینا، وہ ہفتہ بھر سے پیالیاں مانگ رہی تھی........... اور پیسے بھی اس نے ادا کر دیئے تھے''۔

''اچھا پتر........... دے دوں گی........... تو روٹی کھا لے۔ بھوکا ہو گا صبح منہ اندھیرے گھر سے نکل گیا تھا........... تجھے بھوک لگی ہو گی ادھر مجھے پکڑا دے پیالیوں والا تھیلا۔''

شاکو جس کی ڈاڑھی اور بال بے ہنگم طریقہ سے بڑھے ہوئے تھے اور جس نے میلا کچیلا کرتا پہن کر رکھا تھا۔ تھیلا بڑھیا کو پکڑا کر اندر جھونپڑی میں جا کر چارپائی پر نیم دراز ہو گیا اور کہنے لگا۔
''اماں........... پانی پلا دے........... سخت پیاس لگی ہے........... پتہ نہیں ہماری سزا کب ختم ہو گی!''
بوڑھی زیب النساء بولی۔
''صبر کر پتر........... صبر........... اللہ کریم و رحیم ہے........... غفور

الرحیم ہے۔خطاؤں کو بخشنے والا ہے............وہ تو دلوں کا حال تک جانتا ہے۔ہماری آزمائش وسزا
کا وقت بھی ختم ہو جائے گا‘‘۔

شاکو تاسف بھری آواز میں بولا۔

’’اماں................اگر ابا پیالی پیر پر جھوٹا الزام نہ لگاتے تو ہم آج اربوں کے مالک ہوتے
.........ہائے..........ابا کو کیا ہو گیا تھا ....جو (پیالی پیر) مانجو،کو ملازمت سے برخواست
کر دیا۔‘‘

’’بس!پتر............اس منحوس گھڑی کو یاد نہ کر............ یہ باتیں کریدنے پر دل مزید دکھ جاتا ہے
۔‘‘

شاکو بولا............’’اگر مجھے معلوم ہوتا کہ پیالی پیر نے’’دارالعرفان‘‘میں رہنے کے دوران
سالوں فاقے کئے ہیں اور کسی سے ذکر تک نہیں کیا،تو میں ابا جی کو خود ساتھ لے جا کر پیالی پیر سے
معافی منگواتا............لیکن اس وقت میں چھوٹا تھا۔مجھے کیا علم تھا کہ پیالی پیر کو ملازمت سے
نکالنے پر ہمیں یہ دن بھی دیکھنے پڑیں گے.......... پیالی پیر دارالعرفان میں کیا ڈیوٹی سرانجام
دیتے تھے؟......‘‘

’’شاکو!............وہ خادم اور جاروب کش تھے،لیکن ہمیں کیا علم تھا کہ وہ اللہ سے لو لگائے بیٹھے تھے
۔ہم ان کو روکتے ٹوکتے اور جھڑکتے رہتے تھے.................اور پھر تمہارے ابا جی نے
انہیں ملازمت سے بھی نکال دیا..........تمہارے ابا کو غصہ تھا کہ پیالی پیر(مانجو)نے دارالعرفان
سے اکھٹی کئی سو پیالیاں گم کر دی ہیں...........

’’کیا واقعی انہوں نے گم کی تھیں پیالیاں؟‘‘ شاکو نے پوچھا

’’کیا پتہ شاکو!............ مجھے اصل واقعہ نہیں معلوم۔تمہارے ابا کا کہنا تھا کہ مانجو(پیالی پیر)نے
سینکڑوں پیالیاں گم کر دی ہیں یا پھر خود دانستہ چوری کر لی ہیں..........پھر اس ہی الزام کی پاداش
میں تمہارے ابا جی نے مانجو کو دارالعرفان سے نکال دیا.................’’بس پھر اسی دن کے بعد بد
نصیبی نے ہمارے ہاں ڈیرے ڈال لیے...........‘‘

شاکو بولا............’’اور آج..........آج ہمارا یہ حال ہے کہ’’مانجو‘‘جو اب’’پیالی پیر‘‘کے نام
سے موسوم ہیں،کے مزار پر لوگوں کی طرف سے بطور منت/چڑھاوہ

مانی گئی پیالیاں لاکر اپنے گھر کا خرچ چلاتے ہیں............‘‘

’’شاکو!..........خدا کی عجب شان ہے۔جن پیالیوں کے گم ہونے کا جھوٹا الزام مانجو پر لگایا گیا،
آج ایسی ہی پیالیاں ہماری آمدن کا ذریعہ بن گئی ہیں..........خدا کی گرفت ناگہانی اور سخت ہوتی
ہے۔تمہارے ابا تھوڑے فیاض تو نہیں تھے...........چپکے چپکے کئی بیواؤں کا خرچ اٹھاتے تھے
...........لیکن مانجو کے فاقے انہیں نظر نہ آسکے...........جو ہاتھ پھیلا کر مانگ لے...........اس
کے لئے تو کوئی کمی نہیں ہوتی............لیکن خودداری اور سفید پوشی تو ہر لحہ آدمی پر قیامت ڈھاتی
رہتی ہے اور یہی چیز تمہارے ابا کو سمجھ نہ آسکی..........وہ لوگوں میں پیسہ بانٹ رہے تھے اور ان کا
اپنا ملازم برسوں فاقے کرتا رہا..........ان گزرے وقتوں کی یادیں بھلا دے پتر.............
دل میں ہول اٹھنے لگتے ہیں۔میں ساگ روٹی پلیٹ میں ڈال کر لے آتی ہوں...........تو لالٹین
جلا لے..........‘‘اتنا کہہ کر رعشہ سے لرزتی زیب النساء جھونپڑی کے دروازے سے باہر نکل گئی۔
شاکو نے چارپائی پر لمبی آہ بھری تو اس اثناء میں بجلی آنے سے جھونپڑی کا واحد برقی قمقمہ جو مٹی،
دھول اور دھویں سے تقریباً سیاہ پڑ چکا تھا روشن ہو گیا........... قمقمے کی کجلاتی کرنوں نے جھونپڑی
کے اندر ہر چیز کو واضح کر دیا تھا...........چارپائی کے سامنے دیوار کے ساتھ فرش پر چٹائی بچھی
ہوئی تھی،جس کے ایک سرے پر بوڑھی زیب النساء نے اپنا بستر تہہ کر کے اوپر میلی کچیلی سی چادر
ڈال دی تھی۔جھونپڑی کے عین وسط میں ایستادہ ستون پر گاڑھی کیل کے ساتھ لالٹین لٹک رہی تھی
۔ستون کے ساتھ ہی نیچے کچے فرش پر مٹی کا گھڑا تھا،جس کا منہ چینی کی پلیٹ سے ڈھکا ہوا تھا۔عقبی
دیوار کے ساتھ شاکو کا ایک کپڑوں کا جوڑا الٹکا ہوا تھا...........لکڑی کی ایک بوسیدہ الماری میں
مختلف طرح کی تقریباً چھے درجن پیالیاں رکھی ہوئی تھی،جن پر بوڑھی زیب النساء نے مومی کاغذ
چڑھا رکھا تھا........... پیالیوں پر نظر پڑتے ہی شاکو کو اپنا پورا بچپن یاد آ گیا.................وہ آج
پھر پیالی پیر کے مزار سے اٹھارہ پیالیاں لے آیا تھا...........ان لوگوں کی گزر اوقات کا واحد ذریعہ
یہی پیالیاں تھیں........... پیالیاں۔یہ پیالیاں شاکو’’پیالی پیر‘‘کے مزار پر صفائی ستھرائی اور جھاڑو
دینے کے عوض لاتا تھا اور شاکو کی بوڑھی ماں زیب النساء ان پیالیوں کو محلے اور اڑوس پڑوس کے
گھروں میں فروخت کر دیتی تھی...........اور حاصل ہونے والی آمدن سے گھر کا خرچ نکل آتا
تھا۔تقریباً پچیس برس پہلے واقعات شاکو کو یاد آ گئے۔جب وہ تیرہ چودہ

برس کالڑکا تھا...........ان لوگوں کی زندگی شاہانہ انداز سے گزر رہی تھی۔گاڑیاں،کوٹھیاں،زمینیں ،جائیدادیں،سب کچھ ان کے پاس تھا۔دین ودنیا کی ہر نعمت انہیں میسر تھی۔گھر میں کام کاج کے لیے چار پانچ نوکر تھے۔شاکو کے والد کا بزنس مختلف شہروں کے علاوہ بیرون ملک تک پھیلا ہوا تھا ....ان کے سینکڑوں ملازم تھے،جوشاکو کے آگے پیچھے بچھے جاتے تھے...........اس کا یہ نام تو حالات کی ستم ظریفی کی وجہ سے پڑ گیا تھا...........اس وقت سب شاکو کوشکیل احمد کے نام سے پکارتے اور بلاتے تھے...........شکیل احمد جواپنے ابا کی طرف سے منعقد کیے جانے والے مختلف پروگراموں اور تقاریب میں بڑے بڑے لوگوں کواپنے ہاتھوں سے انعامات دیتا تھا۔اس کے والد شہر کے سب سے متمول اور معروف آدمی تھے،جن کی درجنوں کوٹھیاں کرایے پر لگی ہوئی تھیں...........لیکن آج یہ سب کچھ ایک خواب اور سراب لگتا تھا...................شاکو کے ابا بے انتہا متمول ہونے کے ساتھ ساتھ مذہب کی طرف بھی بہت زیادہ میلان رکھتے تھے۔جواکثر اپنے گھر میں ذکروسلام کی محافل منعقد کرواتے اور علاوہ ازیں دارالعرفان میں بھی کئی مذہبی پروگراموں کا سال کے دوران انعقاد کروادیتے اوران تقاریب پر سالانہ بیس تیس لاکھ روپے کے اخراجات اٹھ جاتے۔پھر''دارالعرفان'' کے نام سے ادارہ قائم کرنے کی وجہ تسمیہ کی یادیں شاکو کے ذہن میں تازہ ہوگئیں...........شاکو کے ابا کا رابطہ ایک ایسے بڑے ادارہ یا تنظیم سے ہوا،جومعاشرہ میں مذہب سے متعلق فکروشعور اور حقیقت مذہب کی سوچ بیدار کرنے کے لیے سرگرم عمل تھی۔اس تنظیم کی مساعی شاکو کے ابا کو بہت پسند آگئیں اورانہوں نے اس تنظیم کومشورہ وتجاویز دے کر تنظیمی مشن کے فروغ وترویج کوفعال وموثر انداز میں سرانجام دینے کے لیے''دارالعرفان'' کے نام سے ایک سنٹر کھول لیا...........۔

چند ماہ بعد باقاعدہ ایک شیڈول ترتیب دے کر دارالعرفان کی سرگرمیوں کا ہفتہ وار، ماہانہ اور سالانہ تعین کردیا گیا...........نہیں معلوم مانجو نام کا ایک بے سہارا ومفلوک الحال شخص ابا کو کہاں سے مل گیا جسے انہوں نے''دارالعرفان'' میں صفائی ستھرائی،چوکیداری اور جاروب کشی کے لیے ملازم رکھ لیا........... مانجو کی نجی زندگی کے حالات کسی کومعلوم نہ تھے۔بس صرف یہ علم تھا کہ اس کے دوچھوٹے چھوٹے بچے اور بیوی ہے اور مانجو بے روزگاری کے ہاتھوں ستایا ہوا ہے۔ مانجوکواس وقت''دارالعرفان''میں ملازم رکھا گیا تھا،جب

''دارالعرفان'' کی عمارت ابھی زیر تعمیر تھی...............مانجو دن رات دارالعرفان میں رہتا اور کام میں مصروف رہتا...........کئی ماہ تک اسے کسی نے تنخواہ نہ دی اور یہ بات تک بھی نہ پوچھی وہ کھاتا پیتا کہاں سے ہے۔یہ تو بہت بعد میں معلوم ہوا کہ مانجو دوسرے تیسرے دن ایک یادوروٹی کھالیتا تھا،لیکن مانجو نے کبھی کسی سے اس بات کا ذکر نہ کیا۔شدید قلت غذا سے مانجوسوکھ کر کانٹا بن گیا........... بیچارے نے چھ سات ماہ فاقہ کشی میں گزار دیئے...............شاکوکو یاد آیا کہ ایک بار وہ اپنے ابا کے ہمراہ''دارالعرفان'' میں گیا تواس کی پالتو بلی بھی اس کے ہمراہ تھی۔وہ ''دارالعرفان''میں گھنٹہ بھر ٹھہرا رہا اور پیاری بلی کی بھوک محسوس کرنے پر اس نے شاکو سے پوچھا تھا کہ یہاں دودھ ہوگا؟ توشاکو چپکے سے زیرلب بولا تھا کہ''میں نے تو کئی ماہ سے دودھ کی شکل بھی نہیں دیکھی...........''...........شاکوکو کیا معلوم تھا کہ جس مانجو سے وہ اپنی بلی کے لیے دودھ مانگ رہا ہے وہ کئی دنوں کے فاقے سے ہے........... پھر شاکو کو ایک اور واقعہ یاد آگیا کہ چند برس گزرنے کے بعد کئی لوگ''دارالعرفان'' کے ممبر بن گئے توانہوں نے اتفاق رائے سے ایک بلڈ بینک قائم کرنے کا آغاز کیا۔ ''دارالعرفان'' کے تمام ممبران سے کہا گیا کہ فلاں ہسپتال میں جا کرخون دے آئیں تاکہ یہ خون وہاں مستحق مریضوں کوفری دیا جاسکے۔اس حکم کا اطلاق مانجو پر ہوا ....مانجو بے چارہ ایک دن دارالعرفان کی صفائی ستھرائی کرنے کے بعد خون دینے ہسپتال چلا گیا،توڈاکٹروں نے اس سے کہا کہ''تمہارے جسم میں خون نہیں''...........تمہیں خون دینے کی نہیں، بلکہ خون لینے کی ضرورت ہے''۔طوہاًوکرہاًمانجو''دارالعرفان'' واپس آگیا...........اس بات کا اسے بڑا دکھ پہنچا کہ''دارالعرفان'' کے لیے اس کے جسم سے خون کی چند بوندیں بھی نہ نکل پائیں''۔بھلا سال ہا سال فاقے کرنے والے کے جسم میں اتنا خون کہاں سے آتا کہ وہ خون عطیہ کرپاتا!!!!

پھر...........پھر...........اس منحوس دن شاکو کے بھرے پُرے خاندان کی بدنصیبی کا آغاز ہوا...........جس دن''دارالعرفان''میں ایک بڑی تقریب ہورہی تھی ....''دارالعرفان'' کے تقریباًسب ہی ممبران تقریب میں شریک تھے...........شاکو کے ابا جو''دارالعرفان'' کے نگران تھے،نے''دارالعرفان''میں موجوداشیاء کی فہرست مانجو سے طلب کی اورفہرست دیکھنے کے بعد انہوں نے مانجو کو بلاکراس سے پوچھا۔

"میں نے چار سو پیالیاں دارالعرفان میں بھجوائی تھیں، مگر اس فہرست میں دو سو ہی ہیں ....باقی دو سو پیالیاں کہاں گئیں؟؟ .... مانجو نے کلمہ پڑھ کر قسمیں اٹھائیں کہ دارالعرفان میں صرف دو سو پیالیاں ہی بھیجی گئی ہیں اور ہم لوگوں نے انہیں خود گن کر رکھا تھا..........لیکن شاکو کے ابا جو دارالعرفان کے نگران تھے نہ مانے۔ مانجو نے بہت صفائی پیش کی کہ اگر پیالیاں چوری ہوئی ہوتیں یا میں ادھر اُدھر کرتا تو چار سو پیالیوں میں سے چالیس پچاس کم ہوتیں یا سو کم ہو جاتیں..........لیکن دو سو پیالیاں تو یکبار کم نہ پڑتیں.........مگر شاکو کے ابا نے مانجو کی قسموں پر بھی یقین نہ کیا۔ مانجو نے کہا کہ آپ نے ضرور چار سو پیالیاں خریدی ہوں گی دو سو گھر یا کہیں اور دے دی ہوں گی.......... یہاں صرف دو سو ہی لائی گئی ہیں..........مگر شاکو کے ابا نے مانجو کی اس بات کو تسلیم نہ کیا.......... یہ تو بہت بعد میں معلوم ہوا کہ شاکو کے ابا مانجو کو دارالعرفان سے نکالنا چاہتے تھے اور اس کی جگہ کسی دوسرے اپنے پسندیدہ شخص کو ملازم رکھنا چاہتے تھے..........پھر..........پھر چند ماہ بعد ادھیڑ عمر مانجو کو دارالعرفان سے نکال دیا گیا۔

..........اپنی زندگی کے طویل حصہ میں فاقہ کشی سہنے والے کے دل میں تاسف کی خاص کیفیت پیدا ہو جاتی ہے.......... مانجو کے تو بیوی بچے بھی تھے۔ آمدن کے جس ذریعہ سے وہ اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پال رہا تھا، جب وہ ذریعہ بھی اس سے چھوٹ گیا تو کمزور و لاغر مانجو ہر روز کئی گھنٹے بیٹھا روتا رہتا..........وہ نکالے جانے کے بعد بھی روتا ہوا ایک بار دارالعرفان آیا اور قسمیں اٹھائیں کہ پیالیاں اس نے نہ چوری کی ہیں اور نہ گم کی ہیں، اسے دارالعرفان سے نہ نکالا جائے ....لیکن شاکو کے ابا نے اسے دھتکار دیا.......... مانجو نے زار و قطار روتے ہوئے کہا ....میں کوئی گلہ نہیں کرتا..........میرا معاملہ صرف اللہ کے سپرد ہے..........وہ اللہ جسے میرے دل میں ابھرنے والے خفیف سے خفیف وسوسہ اور خیال کی بھی خبر ہے۔

ملازمت چھوڑنے کے بعد مانجو کے دو بیٹے جو دوسری اور تیسری کلاس میں پڑھتے تھے، یکے بعد دیگرے بیماروں کا شکار ہو گئے۔ بڑے بیٹے کو ہیضہ ہوا، لیکن مانجو اس کا مطلق علاج نہ کروا سکا۔ چند دن بیمار رہنے کے بعد وہ جان کی بازی ہار گیا.......... چند ماہ بعد دوسرے پھول جیسے معصوم بچے کو ٹائیفائیڈ ہو گیا اور وہ بھی کوئی ہفتہ بھر بیمار رہنے کے بعد فوت ہو گیا.......... مانجو کی بیوی بے پناہ غربت اور اپنے دو بچوں کے لاعلاج مرنے کے

شدید صدمہ سے ذہنی توازن کھو بیٹھی.......... مانجو یا تو مجذوب ہو گیا یا پھر اس نے عرفان کے زینے پر قدم رکھ دیا تھا۔ اس کی زبان سے بس صرف یہ ہی الفاظ نکلتے.........."اللہ..........اللہ .... پیالیاں.......... پیالیاں.........." .... مانجو کئی ماہ آوارہ گھومتا رہا.......... اور پھر ایک قبرستان کے ساتھ گھنے درختوں میں ڈیرہ جما لیا..........اہل علاقہ نے اس سے گور کنوں کا کام لینا شروع کر دیا..........اور بارش دھوپ سے بچنے کے لیے قبرستان کے ساتھ ملحقہ درختوں کے جھنڈ میں چند خستی چادریں لکڑی کے ستون نصب کر کے گاڑھ دیں اور پھر یہ جگہ مانجو کا مستقل ٹھکانہ بن گئی..........رفتہ رفتہ اہل علاقہ مانجو سے مانوس ہوتے چلے گئے ....وہ اسے روٹی، چائے لا دیتے لیکن مانجو پیالی واپس نہ کرتا..........اگر پیالی کوئی واپس لے جانے کے لیے اٹھاتا تو مانجو میں بجلی سے کوند جاتی اور وہ فوراً جھپٹ کر پیالی چھین لیتا ....اکثر اوقات مانجو بغیر کسی کے بتائے قبر کھودنا شروع کر دیتا۔ جب قبر تیار ہوتی تو علاقہ میں کوئی نہ کوئی موت واقع ہو جاتی..........اہل علاقہ نے جلد ہی اندازہ لگا لیا کہ کسی کے فوت ہونے سے پہلے ہی مانجو کو علم ہو جاتا ہے اور وہ قبر کھودنا شروع کر دیتا ہے۔ اس بات سے علاقہ میں مانجو کی عزت و تکریم بڑھ گئی اور مانجو کے لیے کھانا میں لائی گئی پیالیوں کو مانجو کی طرف سے واپس نہ لوٹانے پر لوگوں نے مانجو پر "پیالی پیر" کا نام چسپاں کر دیا۔ یہ پیالیاں جب رفتہ رفتہ جمع ہو جاتیں تو محلّہ کے شریر لڑکے مانجو سے نظریں بچا کر یہ پیالیاں لے جاتے۔ جب لڑکوں کی اس کارستانی کا علم اہل علاقہ کو ہوا تو انہوں نے لڑکوں کو سمجھایا اور ہر دو تین ماہ بعد مانجو کے پاس جمع ہو جانے والی پیالیاں فروخت کر کے مانجو کی دیگر ضروریات پوری کر لی جاتیں.......... مانجو چودہ پندرہ برس تک گور کن رہا۔ اور پھر ایک دن مانجو بھی داعی اجل کو لبیک کہہ گیا۔ لوگوں نے باہمی مشورے سے قبرستان سے قدرے الگ درختوں کے اس جھنڈ میں جہاں مانجو کی کٹیا تھی، مانجو کو دفن کر دیا ....رفتہ رفتہ علاقہ کے لوگوں نے مانجو جو "پیالی پیر" کے نام سے مشہور ہو گیا تھا، کے مزار پر پیالیوں کی منتیں ماننا شروع کر دیں۔ چند ہی برس بعد پیالی پیر اتنا مشہور ہو گیا کہ ہر روز سینکڑوں پیالیاں "پیالی پیر" کے مزار پر آنے لگیں۔ دو تین ماہ میں ہزاروں پیالیوں کا ڈھیر جمع ہو جاتا۔ چنانچہ پیالیوں کو سنبھالنے، محفوظ رکھنے اور فروخت کرنے کے لیے اہل علاقہ نے باقاعدہ ایک کمیٹی تشکیل دی اور پیالی پیر کی شہرت دور دور تک پھیلتی چلی گئی

...............شاید دارالعرفان نے مانجو کو عرفان کی منزل تک پہنچا دیا تھا۔

مانجو کو دارالعرفان سے نکالے جانے کے بعد شاکو کے ابا کا بزنس دن بدن ماند پڑنے لگا۔ پہلے بیرون ملک بزنس کی برانچیں بند ہوئیں۔ پھر ملک کے اندر پھیلے بزنس میں مسائل پیدا ہونا شروع ہوئے۔ کئی ملازمین نے فراڈ اور دھوکہ دہی سے بزنس کو نقصان پہنچانا شروع کر دیا۔ پھر کچھ عرصہ بعد شاکو کے چچا کو تاوان کے لیے اغوا کر لیا گیا۔ جنہیں شاکو کے ابا نے کئی کروڑ روپے دے کر چھڑایا...............حالات نے اس طرح پلٹا کھایا کہ شاکو کا خاندان مسلسل مسائل و مصائب کی دلدل میں پھنستا چلا گیا..........شاکو کے ابا پر قتل کا الزام لگا۔ یہ مقدمہ کئی برس چلا اور شاکو کے ابا کو پھانسی کی سزا سنادی گئی۔ تاہم مقتول کے ورثاء نے خون بہا لے کر شاکو کے ابا کو معاف کر دیا۔ شاکو کے ابا کی جان تو بچ گئی لیکن انہیں بیس کروڑ روپے خون بہا ادا کرنا پڑا۔ جو انہوں نے اپنی جائیدادیں اور اثاثے فروخت کر کے ادا کیے۔ شدید پریشانیوں اور حالات کی سختی و جبر نے شاکو کے ابا کو دبوچ لیا۔ آخر کار انہیں جان لیوا مرض کینسر لاحق ہو گیا۔ ان کے علاج پر پیسہ پانی کی طرح بہایا گیا، مگر وہ بڑی حسرت و یاس کے عالم میں دنیا کو خیر آباد کہہ گئے۔

ان کی وفات کے بعد شاکو کے چچا ذہنی طور پر بہت بری طرح پس گئے اور کاروبار چھوڑ کر گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ اس کسمپرسی کے عالم میں قریبی عزیزوں نے ان پر دھاوا بول دیا اور بچی کھچی جائیداد ہتھیانے کے لیے کئی مقدمات عدالت میں قائم کر دیئے..........اور..............

پھر ایک دن شاکو جو پہلے شکیل احمد تھا، کو اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ اس جھونپڑی میں رہائش اختیار کرنا پڑی۔ بے روزگاری محتاجی، درماندگی اور بے بسی نے شاکو کو نڈھال کر دیا..........اس کی تعلیم ادھوری رہ گئی..........ایک دن اماں اسے اپنے ساتھ ''پیالی پیر'' کے مزار پر لے گئیں۔ اماں گھنٹوں پیالی پیر سے رو رو کر معافی مانگتی رہیں.......... پیالی پیر کے مزار کا انتظام سنبھالنے والے نگران نے جب ایک خستہ حال بڑھیا کو زار و قطار روتے دیکھا تو اس کا دل پسیج گیا۔ اس نے زیب النساء سے احوال دریافت کیا تو شاکو کی اماں نے تمام صورت حال انہیں بتا دی کہ پیالی پیر ان کے میاں کے ہاں ملازم تھے جن کا نام مانجو تھا اور ان پر پیالیاں گم کرنے کا الزام لگا کر ان کے میاں نے انہیں ملازمت سے برخواست کر دیا تھا اور آج ان کا یہ حال ہے کہ ان کو فاقے لگ رہے ہیں.......... پیالی پیر کا منتظم نرم دل آدمی تھا۔ اس نے اماں

سے کہا کہ وہ ہر روز شاکو کو پیالی پیر کے مزار پر بھیج دیا کریں تا کہ وہ مزار پر صفائی ستھرائی کرے..........شاید اس عمل سے ان کے قصور کی معافی تلافی ہو جائے۔ اور منتظم پیالیاں یا نقد رقم شاکو کو گھر کا چولہا جلانے کے لیے دے دیا کرے گا...............اس دن کے بعد شکیل احمد (شاکو) نے پیالی پیر کے مزار پر صفائی ستھرائی اور جاروب کشی کے لیے بلا ناغہ جانا شروع کر دیا تھا۔ منتظم مزار، شاکو کو روزانہ کچھ نقدی یا پیالیاں دے دیتا اور یوں ان لوگوں کی گزر اوقات ہو رہی تھی۔

''لو پُتر !..........بجلی بھی آ گئی ہے..........اب اٹھ کر روٹی کھا لے''۔ اماں تھالی اور جھابڑی میں ساگ روٹی اٹھائے دروازے سے اندر آتے ہوئے بولیں۔ اماں کے پکارے جانے کی آواز کانوں میں پڑنے پر شاکو کی ماضی کی یادوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا..........وہ چپ چاپ اٹھا اور کچے فرش پر بیٹھ کر اپنی بوڑھی ماں کی پکائی ہوئی ٹیڑھی میڑھی روٹیاں کھانے لگا، کھانا کھاتے ہوئے اس کا ذہن مسلسل اپنے ناگفتہ بہ حالات اور مکافات عمل کا تجزیہ کرتا رہا۔ سوچ گہری ہونے پر شاکو پر انکشاف ہوا کہ قدرت کی گرفت ہمیشہ دبے پاؤں آتی ہے اور آدمی کو اس طرح جکڑ لیتی ہے کہ آدمی کو کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ آدمی کی آنکھیں اس وقت کھلتی ہیں، جب وہ بند گلی میں پہنچ جاتا ہے۔

☆☆☆☆☆

پکی بیٹھک

ہیراپھیری اورناجائزآمدنی آدمی کی فکر میں ایسی کج روی
اوررخنہ پیداکردیتی ہے کہ پھرآدمی کوصحیح بات سوجھ ہی نہیں پاتی
اوریہ سلسلہ کئی نسلوں تک درازہوجاتاہے۔

تکریم نے جب صبح آٹھ بجے اپنے آفس کا بیرونی گیٹ عبور کیا تو دفتر کی قریبی مسجد سے ایک اعلان کی صدا بلند ہورہی تھی۔اس اعلان کے الفاظ کی سمجھ آتے ہی تکریم کے دل پر سوگواری اور افسردگی چھاگئی.................دفتر کے سٹینوگرافر عرفام قریشی کے والد بزرگوار فوت ہو گئے تھے۔عرفام قریشی تکریم کا کولیگ تھا۔سیدھا سادا، دفتری امور کی انجام دہی میں کوتاہی نہ برتنے والا۔جب بھی اس پر نظر پڑتی اپنی سیٹ پر ٹکا بیٹھا نظر آتا۔کمپیوٹر پر جھکا ہوا۔ایک طرف فائلوں کا انبار..........بے چارے کے سر کے سارے بال جھڑ گئے تھے۔شاید کسی گھریلو پریشانی یا ٹینشن کی وجہ سے۔عرفام قریشی نے کبھی اپنے کام اور فرائض کی ادائیگی میں غفلت یا سستی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا بلکہ یہ خلوص کا بندہ دوسرے سٹینوگرافروں کے کام بھی کرتا رہتا تھا۔اس نے کبھی کام کی زیادتی کا شکوہ نہیں کیا تھا...........ڈی جی صاحب کا کہنا تھا کہ میں جب بھی ادھر سے گزرتا ہوں،"مجھے ہمیشہ وہ ایک گنجا سٹینو اپنی سیٹ پر بیٹھا نظر آتا ہے۔دوسرے دو تین سٹینوگرافروں کو میں نے کبھی اپنی سیٹ پر بیٹھے نہیں دیکھا"۔

عرفام قریشی طبیعت کا ملنسار، قول وفعل کا صاف وکھرا اور پکا، وعدے اور اصول کا پابند، سفید پوش مگر خوددار تھا۔اسکے والد بزرگوار گزشتہ ایک برس سے بیمار تھے۔بے چارے نے ان کی بیماری کے دوران بھی بہت کم چھٹیاں کی تھیں...............وہ تو سب کے کام کرتا تھا، مگر اس کی جگہ کوئی دوسرا کام کرنے پر آمادہ نہ ہوتا تھا۔ایک دوسرے سٹینوگرافر کی عرفام قریشی کے ساتھ ہی تقرری ہوئی تھی، جو بلا کا شاطر اور ذہین تھا۔دواڑھائی برس ہی دفتر میں گزار سکا اور پھر اپنے سیاسی

تعلقات واثر ورسوخ کو استعمال میں لاکر وزارت میں براجمان ہوگیا تھا۔جہاں وہ بڑی ٹھاٹ باٹ و تمکنت سے وزیر صاحب سے اپنی ذاتی تعلقات ومراسم جتا کر محکمہ کے چھوٹے بڑے ملازمین کو ہراساں کرتا رہتا تھا۔حتیٰ کہ آفیسران بھی اس کے سامنے دم سادھ لیتے تھے۔لیکن عرفام قریشی کے سیاسی تعلقات کا کوئی ایسا دائرہ کار نہ تھا..................وہ ملک کے محنتی اور کام کرنے والے طبقہ سے تعلق رکھتا تھا۔یہی وہ طبقہ ہے جس کی توانائیوں اور محنتوں سے ملک کی معاشی واقتصادی رگوں میں گرم لہو دوڑتا ہے..................یہی طبقہ ملک وملت کی دگرگوں حالت اور دم توڑتی ہوئی نبضوں کو مسلسل قوت حیات فراہم کرتا ہے۔اب اس طبقہ کا دم گھٹتا جارہا ہے۔اگر اس کے نیم مردہ جسم سے جان نکل جائے تو پھر باقی کچھ نہیں بچے گا۔ہر سو اندھیرا ہوگا اور پھٹکار برسے گی۔مقتدر طبقہ کے انتظامی ڈھانچہ کی عمارت اس طرح مسمار ہوگی کہ پھر اس کا ڈھونڈنے سے بھی نشان نہیں ملے گا..................حالات اب اس نہج پر آگئے ہیں کہ محنت کار طبقہ کا دم مسلسل گھٹ رہا ہے اور اس کی محنت کی قدر و منزلت کے بجائے اسے اس کی محنت کی اصولی اور جائز اجرت سے بھی محروم کیا جارہا ہے۔

تکریم نے عرفام قریشی کے والد بزرگوار کی فوتگی کے اعلان سے اندازہ لگایا کہ دفتر میں افسردگی کی فضاء چھائی ہوئی ہوگی، لیکن جب وہ دفتر پہنچا تو اس کے تصور و تخیل کی عمارت زمین بوس ہوگئی۔ناظم صاحب نائب قاصدوں اور کلرکوں کو جھاڑ پلا رہے تھے اور انہیں کام چوری پر طعن و تشنیع کے نشتروں سے زندہ درگور کرنے کے درپے تھے۔ایڈمن افسر صاحب ہیڈ کلرک کو پاس بٹھا کر کسی ضروری فائل کے بارے میں اپنی دوراندیشانہ اور بصیرت افروز رائے ومشاورت سے نواز رہے تھے۔شاید یہ فائل اوپر کی آمدنی کے لیے نہایت اہم تھی۔ریسیوڈ اور ڈسپیچ کے کلرک بھی اپنی اپنی سیٹوں پر براجمان تھے۔جو بات بات پر قہقہے لگا رہے تھے۔شعبہ حسابات کا عملہ البتہ مستعدی سے اپنے کام میں مصروف تھا۔دفتر کا اکاؤنٹنٹ حسب معمول اپنی فائلوں پر جھکا ہوا تھا۔جیسے اسے دنیا جہاں کی مطلق خبر ہی نہ ہو۔تکریم ایڈمن آفیسر کے آفس، شعبہ حسابات، اکاؤنٹنٹ کے آفس، شعبہ تعمیرات اور شعبہ کوآرڈینیشن سے ہوتا ہوا عرفام قریشی کے آفس میں پہنچا تو وہاں کوئی نہ تھا

...................ایک نائب قاصد نے استفسار پر بتایا کہ "دوسرا سٹینوگرافر حلیم عرفام قریشی کے والد صاحب کی فوتگی کی اطلاع ملتے ہیں اپنے بائیک پر عرفام قریشی کے گھر

چلا گیا ہے''۔تکریم نے دوبارہ پوچھا''کیا آفس کے باقی لوگ نہیں گئے؟''

''ہمیں کیا معلوم جی،جس کی مرضی ہوتی ہے چلا جاتا ہے''نائب قاصد نے گول مول جواب دیا''۔

تکریم کو بڑا دکھ ہوا۔دفتر میں کسی کو عرفام قریشی کے غم اور دکھ کا احساس نہ تھا۔ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں..........کسی شخص نے ہمدردی اور غمگساری کے دو الفاظ بھی نہیں کہے۔البتہ کاؤنٹس کلرک قمر سلطان نے تکریم کے ساتھ عرفام قریشی کے والد صاحب کی وفات پر گہرے دکھ کا اظہار کیا۔قمر سلطان جلد از جلد عرفام قریشی کے گھر جانا چاہتے تھے تا کہ عرفام قریشی کا غم اور دکھ بانٹ سکیں،اس کی دلجوئی کر سکیں اور دکھ کی اس گھڑی میں چند جملے ہمدردی کے جا کر تو کہیں،مگر وہ دفتری معاملات میں بری طرح الجھے ہوئے تھے..........وہ بھی بے چارے مظلوم اور بے سفارش تھے۔ان کا بھی کوئی سیاسی تعلق کا دائرہ نہ تھا۔لہذا اس قصور کی پاداش میں انہیں دوہرا کام سونپا گیا تھا۔تکریم جلد از جلد عرفام قریشی کے گھر جانا چاہتا تھا،لیکن وہاں جانے کے لیے دو تین گاڑیاں بدلنی پڑتی تھیں۔لامحالہ اس تگ ودو میں بہت سا وقت صرف ہو جاتا۔تکریم نے اپنے دفتر کے ڈرافٹسمین کا انتظار کرنا ضروری سمجھا کیونکہ اس کے پاس بائیک تھی ....یہ پریوں کا شہزادہ ہمیشہ دس گیارہ بجے خراماں خراماں دفتر میں اک ادائے بے نیازی سے آوارد ہوتا تھا..........خدا خدا کر کے آخر کار دس بجے کے لگ بھگ ڈرافٹسمین صاحب آئے تو تکریم نے جھٹ کہا کہ''آؤ!عرفام قریشی کے گھر چلیں۔عرفام قریشی کے والد صاحب وفات پا گئے ہیں۔''ڈرافٹسمین نے گھور کر پہلے تکریم کو دیکھا اور پھر آنکھیں مچکا کر بولا:

''صبر کر تکریم!..........ادھر ٹک کر بیٹھ..........نماز جنازہ کے وقت چلے جائیں گے ....تجھے پتہ نہیں..........ایکسین صاحب نے مجھے(Asbtract of Cost) ایبسٹرکٹ آف کاسٹ بنانے کا کہا ہے..........عرفام قریشی کے والد ہی فوت ہوئے ہیں ....کوئی قیامت نہیں آ گئی۔''

تکریم مزید کچھ نہ کہہ سکا اور چپکے سے آفس سے باہر نکل آیا..........کچھ پیدل اور کچھ گاڑی پر سفر کر کے جب وہ عرفام قریشی کے گھر پہنچا تو جنازہ جنازہ گاہ میں لایا جا چکا تھا اور لوگوں کا ہجوم نماز جنازہ کی ادائیگی کے لیے صف بندی کر رہا تھا۔تکریم بمشکل

نماز جنازہ میں شریک ہو پایا۔نماز جنازہ کی ادائیگی کے بعد تکریم نے دیکھا کہ آفس کے ڈائریکٹر اور دیگر آفیسران کی چمکتی دمکتی گاڑیاں کھڑی ہیں۔چند لمحوں بعد ڈائریکٹر صاحب،اسسٹنٹ ڈائریکٹر اور ایڈمن آفیسر صاحب نماز جنازہ ادا کرنے والوں کے ہجوم سے نکل کر،ادائے بے نیازی اور تمکنت کے ساتھ اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھے،کن انکھیوں سے تکریم کی طرف دیکھا،آپس میں کھسر پسر کی اور پھر خدا کی یہ مخلوق جنازہ گاہ کے میدان سے چلی گئی۔ان لوگوں کو اتنی بھی اخلاقی جرات نہ ہوئی کہ تکریم اور اس کے دو تین دفتر کے ساتھیوں کو اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھا کر دفتر لے جانے کی جھوٹی دعوت ہی دے دیتے۔اب لواحقین نے میت کا تابوت کندھوں پر اٹھا لیا تھا۔یہ لوگ ہولے ہولے قدموں کے ساتھ قبرستان کی طرف چل پڑے۔کئی لوگ باآواز بلند کلمہ طیبہ کا ورد کر رہے تھے۔اس ذکر جلی کی لے بلند ہو کر مدہم ہو جاتی اور پھر دم توڑ دیتی۔ہجوم میں سے پھر کوئی پکارتا''کلمہ شریف پڑھنے سے نہ شرماؤ''..........اس پکار پر ذکر کی لے پھر بلند ہو جاتی،لیکن ہجوم میں زیادہ تر لوگوں نے چپ سادھ رکھی تھی۔کچھ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔اب ہجوم چھٹتا جا رہا تھا۔لوگ چپکے چپکے اس انداز سے ہجوم سے الگ ہو رہے تھے،جیسے اک ناگہانی آفت جاں سے جان چھوٹی ہو۔تکریم بھی سبک روی سے ہجوم کے ساتھ چلا جا رہا تھا..............اس کے لبوں پر مکمل سکوت تھا،گویا ہونٹ سلے ہوئے ہوں،مگر دماغ تیز و تند خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔خیالات کے کئی جھکڑ چل رہے تھے۔اس نے کئی جنازوں میں شرکت کی تھی۔جنازوں میں شریک ہونے والے لوگوں کی لائی گئی گاڑیوں کی زیادہ تعداد کو عزت و توقیر کی علامت سمجھا جاتا ہے۔کسی وزیر مشیر کی شرکت تو لازماً باعث عزت و شرف سمجھی جاتی ہے..........لیکن عرفام قریشی کے والد ایک عام آدمی تھے..........وہ بھی غنیمت تھا کہ دفتر کے افسروں نے اس جنازہ میں شرکت کسر شان نہ سمجھی اور نماز جنازہ میں شریک ہو گئے..........تکریم کو یاد پڑا کہ جب منسٹر صاحب کے والد گرامی فوت ہوئے تھے تو دفتر کے بعض افسروں نے منسٹر صاحب کے گھر اپنا پکا ٹھکانہ بنا لیا تھا۔اپنے خرچ پر دیگیں پکوا کر لے جاتے تھے۔چالیسویں تک تو مدرسہ کے بچوں کو بلا کر ان سے قرآن خوانی کرواتے رہے۔دفتر حاضری کے بعد سیدھے وزارت میں چلے جاتے اور پھر وہاں حاضری لگوانے کے بعد دن ڈھلے دفتر پہنچتے..........مگر عرفام قریشی کے والد کی فوتگی پر تو سب نے یوں منہ بنا لیا تھا جیسے کسی بہت بڑے نواب یا رئیس زادہ کو اپنی قیمتی پوشاک

پر کیچڑ کے چھینٹے پڑنے ناگوار گزرتے ہیں..........بے بس و بے نوا، بے سفارش، غریب و بے بضاعت، محبّ وطن وقوم، ایماندار و دیانت دار آدمی کے نصیب ہمیشہ ایک جیسے ہی رہتے ہیں۔خواہ وہ مزدور ہو، مکینک ہو، دوکاندار ہو، یا کسی ادارے میں کلرک، سٹینو، ٹائپسٹ یا نائب قاصد۔کسی بھی معاشرتی سطح پر اسے جائز مقام نہیں مل پاتا۔ہمارے معاشرے کا یہ ایک ایسا روگ ہے، جو ایک دن پوری قوم کو نگل لے گا..............تکریم جنازہ کے ساتھ چلتا رہا۔جنازہ گندم کے کھیتوں کی منڈیر سے گزارا گیا..........راستہ تنگ تھا۔چلنا دشوار ہورہا تھا۔ہجوم کے لوگ ایک ایک کرکے ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کے ساتھ آگے بڑھنے لگے۔کلمہ طیبہ کا ردھم مدھم پڑنا شروع ہوا تو شاید کسی نے مدہم پڑتے ہوئے ذکر میں پھر سے ابھار لانے کے لیے زور سے صدا لگائی ''لا الہ الا اللہ'' اسکے ساتھ ہی ''نہ ہائے اللہ'' کی صدا ''دھپ'' کی آواز کے ساتھ سماعت سے ٹکرائی، جس سے سب کی دبی دبی ہنسی نکل گئی۔پھر ہجوم پکارنے لگا۔''دیکھو..............نیچے کون گر گیا ہے۔ذرا نیچے اتر کر اٹھانا..........چوٹ تو نہیں آئی..........'' دراصل تنگ منڈھیر سے گزرتے ہوئے کوئی نیچے گر گیا تھا اور گرتے ہوئے ''ہائے اللہ'' پکارا تھا۔

جنازہ دفن کرکے قبر پر ہاتھوں سے مٹی ڈالنے کے بعد تکریم عرفام قریشی کے ساتھ قبرستان میں اگے ایک درخت کے گھنے سائے میں بیٹھ گیا۔عرفام قریشی بے چارہ درد والم میں ڈوبا ہوا تھا۔دفتر کے سب لوگ نماز جنازہ کی ادائیگی کے بعد چلے گئے تھے۔صرف تکریم ابھی تک یہاں تھا..........تکریم عرفام قریشی سے رخصت لینے کا ارادہ کر رہا تھا کہ ایک طرف سے جھومتے جھامتے ڈرافٹسمین صاحب آپہنچے اور عرفام قریشی سے ہمدردی جتاتے ہوئے افسوس کا اظہار کرنے لگے..........تکریم نے ان سے پوچھا ''ایبسٹکر کٹ آف کاسٹ'' بن گیا تھا سر؟ ....انہوں نے جھنجلا کر کہا ''بھاڑ میں جائے (Asbtract of Cost) ایبسٹکر کٹ آف کاسٹ۔میں تو اسی وقت دفتر سے نکل آیا تھا جب مسجد سے فوتگی کا اعلان سنا۔راستے میں بائیک خراب ہو گیا تھا۔تب یہاں تاخیر سے پہنچا ہوں..........اس بائیک کی خرابی کی وجہ سے نماز جنازہ میں بھی شریک نہ ہو سکا''..............عرفام قریشی بولا..............''نہیں ڈرافٹسمین صاحب! اکثر ایسا ہو جاتا ہے..........آپ کے دل میں تڑپ تھی..........تب ہی یہاں پہنچے ہو''۔عرفام قریشی جب کسی تعزیت کے لیے آنے والے شخص

کے ساتھ تھوڑا پرے ہوا تو ڈرافٹسمین صاحب نے دھیمے لہجے میں تکریم کو مخاطب کیا۔ ''اوئے تکریمے!..........اب چل بھی نا..........ادھر پکی بیٹھک تو نہ لگا۔چل میرے ساتھ تجھے بائیک پر بٹھا کر لے جاؤں گا..........پھر نہ کہنا کہ تمہاری بائیک ہمارے کچھ کام نہیں آتی''۔تکریم جھٹ بولا: ''آپ کی بائیک تو پہلے ہی خراب ہے..............مجھے ساتھ کیسے لے جائیں گے سر؟''
ڈرافٹسمین صاحب تکریم کے اچانک اس استفسار پر جھینپ گئے اور پھر سرگوشی سے بولے ....اوئے سمجھا کر......نا..........عرفام قریشی کے آگے تو کوئی بہانہ کرنا ہی تھا نا۔'' تکریم مزید کچھ استفسار نہ کر سکا۔جب ڈرافٹسمین صاحب بائیک اسٹارٹ کرنے لگے تو ایک مہنگی گاڑی اچانک آ کر رکی، تو تکریم نے دیکھا کہ یہ اس کے ادارہ سے بڑے بڑے تعمیراتی ٹھیکے لینے والے ٹھیکیدار وجاہت صادق تھے۔ڈرافٹسمین صاحب نے انہیں جھک کر خوشامدانہ سلام کیا اور پھر مودبانہ لہجہ میں بولے..........''سر! آپ کا 35 لاکھ کا بل میں نے بنا دیا ہے، لیکن کچھ میری فیس کا بھی دھیان رکھنا''۔وجاہت صاحب جھٹ بولے..........''ہاں ہاں..........کیوں نہیں''۔اتنا کہہ کر وجاہت صادق صاحب نے اپنی جیب سے 40 ہزار روپے نکال کر ڈرافٹسمین صاحب کو دے دیئے۔وجاہت صادق صاحب کے جانے کے بعد ڈرافٹسمین صاحب تکریم سے مخاطب ہوئے۔''اوئے..........تکریمے..........دیکھ..............خدا کس طرح الجھے معاملات سیدھے کر دیتا ہے..........اگر ہم ہمدردی جتانے کی خاطر عرفام قریشی کے ہاں بیٹھک لگا کر بیٹھ جاتے تو 40 ہزار روپے مجھے کیسے مل پاتے!..............خدا کا شکر ہے کہ میرا بیٹا بیمار تھا۔عین ضرورت کے وقت 40 ہزار مل گئے۔تم سے کیا چھپانا..........بل کے سرکاری چارجز تو صرف ایک ہزار ہیں مگر مجھے خدا نے پورے چالیس ہزار دے دیئے۔بیٹے کے علاج کے لیے رقم کا ذریعہ پیدا ہو گیا..........ورنہ میں کس کے آگے ہاتھ پھیلاتا''..............تکریم کچھ نہ بولا..........اور طوعاً و کرہاً بائیک پر بیٹھ گیا..........مگر راستہ بھر وہ سوچتا رہا کہ ہیرا پھیری اور ناجائز آمدنی آدمی کی فکر میں ایسی کج روی اور رخنہ پیدا کر دیتی ہے کہ پھر آدمی کو صحیح بات سوجھ ہی نہیں پاتی اور یہ سلسلہ کئی نسلوں تک دراز ہو جاتا ہے۔

☆☆☆☆☆

شکایات کا دفتر

ننھی نگارش نے مستحکم تہیہ کیا کہ وہ اللہ تعالیٰ تک ہر حال میں پہنچنے کی
کوشش کرے گی اور جب اللہ تعالیٰ اس کو مل گئے تو وہ خوب باتیں
کرے گی۔اللہ سے پوچھے گی کہ اللہ تعالیٰ نے
کیوں اسے اپنی ذات سے دور کردیا تھا............
اور پھر وہ شکایات کا دفتر کھول کر رکھ دے گی۔

آسمان پر پچھلے پہر جھلمل تارے چمک رہے تھے۔رات نے آدھے سے زیادہ سفر طے کرلیا تھا۔''نگارش'' کا گاؤں گہرے سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ہلالی چاند بھی رات کے اس سکوت کو غنیمت جان کر افق سے کافی اوپر چڑھ آیا تھا۔آسمان پر ستارے ٹولیوں کی شکل میں سرگوشیاں کرتے محسوس ہوتے تھے۔نگارش کے گاؤں کی ہر چیز پر گہرا سکوت چھایا ہوا تھا۔رات کے اس پہر کتے بھی جو بھونک بھونک کر آسمان پر سر پر اٹھا لیتے تھے،شاید تھک گئے تھے اور اب رات کی سردی سے بچنے کے لیے گھروں کی کونوں کھدروں میں کہیں دبکے بیٹھے تھے۔
..........نگارش اپنی دادی اماں کے ساتھ ان کی چارپائی پر ان کے پہلو میں لیٹی جاگ رہی تھی ....ضعیف و ناتواں دادی اماں گہری نیند میں بے سدھ لیٹی خراٹوں پر خراٹے لے رہی تھیں۔''نگارش'' کی آنکھوں میں آنسو تھے۔وہ سوتے وقت بھی چپکے چپکے روتی رہی تھی ....دادی اماں نے اس پر نورنامہ پڑھ کر بھی پھونکا تھا..........مگر اب پھر آنکھ کھلتے ہی اسے اپنی آٹھ سالہ زندگی کے بہت سے واقعات یاد آ گئے..........اور اسے پھر شدت سے رونا آ گیا تھا..........اس نے اپنے دل کے جذبات کچلنے اور انہیں ادھر ادھر کرنے کی بہتیری کوشش کی مگر اس کے آنسو نہ رک پائے۔آنکھ کھلتے ہی اسے ایک اندیشہ لاحق ہو گیا تھا کہ کہیں اس

کے مکان کے عقب میں واقع بڑی چٹان اس کے کچے مکان پر گر نہ جائے..........اس کا کچا مکان جس کے عقب میں ایک بلند پہاڑی ٹیلہ ابھرتا ہوا کافی بلندی تک چلا گیا تھا۔جنوب مغرب میں ایک بہت اونچی بالکل ڈھلوان پہاڑی تھی،جس کی بلندی سے اگر پتھر لڑھکا دیئے جاتے تو وہ سیدھے اس کے مکان کی دیوار سے جا ٹکراتے تھے..........مشرقی سمت میں بھی ایک ڈھلوان پہاڑی نشیب میں بہت دور تک چلی گئی تھی،جس کا اختتام ایک نالے پر ہوتا تھا۔شمال کی طرف ایک بہت ہی بڑی چٹان اس کے مکان پر جھکی ہوئی تھی،جس کے نیچے اس نے اپنی گڑیا رکھی ہوئی تھی۔کیونکہ اس چٹان کے نچلے دھانے پر بارش کا ایک قطرہ بھی نہ گر پاتا تھا اور یہ اس کی گڑیا کا محفوظ قدرتی گھر تھا..........''نگارش'' کو اندیشہ اسی چٹان کا تھا کہ کہیں رات کو اچانک یہ قوی ہیکل چٹان اس کے کچے مٹی کی چھت والے مکان پر گر نہ جائے کیونکہ وہ جھکی ہی اس طرح تھی کہ گرنے والی لگتی تھی..........اور یہ چٹان تھی بھی اتنی بڑی کہ اس کا پورا مکان اس کے نیچے دب جاتا۔یہ سوچ کر اسے ایک جھرجھری سی آ گئی اور پھر ساتھ ہی اسے اپنی دوسری جماعت کی اردو کی کتاب پر وہ جملہ لکھا ہوا یاد آیا کہ..........''اللہ ہی ہم سب کا محافظ و نگہبان ہے''۔

اس خیال کے آتے ہی اسے اللہ میاں شدت سے یاد آ گئے اور وہ سوچنے لگی کہ اللہ تعالیٰ ہمارے محافظ و نگہبان کس طرح ہیں؟اگر اتنی بڑی چٹان اس کے مکان پر گر پڑی تو اللہ تعالیٰ اسے کس طرح بچا پائیں گے!!..........اس چٹان کو کئی کرینیں مل کر بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتی تھیں..........اللہ میاں اسے کس طرح ہٹا پائیں گے؟؟یہ سوچ کر ننھی نگارش کا ننھا سا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور اس نے پاس لیٹی سوئی ہوئی دادی اماں کو آواز دی۔

''دادی اماں..........دادی اماں..........ذرا جاگو تو سہی''۔

لیکن دادی اماں اس کی مدھم سی پکار پر تو نہ جاگیں..........البتہ ان کے خراٹے مزید بلند ہو گئے تھے..........وہ ایک دو بار دادی اماں کو پکار کر خاموش ہو گئی..........اس کے ذہن میں مسلسل سوچیں ابھر رہی تھیں۔صبح اسے ماں دودھ اور مکئی کے آٹے کی پکی ہوئی موٹی سی روٹی دیتی تھی،جسے وہ بمشکل آدھا ہی کھا پاتی..........اماں ہمیشہ اصرار کرتیں کہ''پوری روٹی کھا لے نگارش''..........مگر وہ جواب دیتی..........''اماں!..........پوری روٹی نہیں کھائی جاتی مجھ سے''۔کبھی کبھی اس کی اماں اسے گندم کے آٹے کے نان بھی

پکا کر دیتی تھیں جس پر ہمیشہ اس کا مطالبہ ہوتا کہ نان کے بجائے اسے پراٹھا پکا کر دیا جائے اور اماں اکثر اس کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اسے گھی میں تر بہ تر پراٹھا پکا کر دیتیں اور کبھی گھر میں گھی نہ ہونے کا کہہ کر خشک نان یا روٹی ہی دیتیں................وہ ناشتے کے بعد سکول کے لیے چل پڑتی۔اس بڑی چٹان سے گزرنے کے بعد آگے راستے کے دونوں طرف خودرو پھولوں والی جھاڑیوں، کانٹے دار جھاڑیوں اور چیڑھ کے دیوہیکل درختوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ....سورج کی کرنیں بلند و بالا چیڑھ کے ایستادہ درختوں سے چھن چھن کر زمین پر پڑتیں ....جب وہ یہاں سے گزر رہی ہوتی تو ان چھنتی ہوئی سورج کی کرنوں سے کبھی اس کا چہرہ سائے میں ہوتا اور کبھی جگمگا اٹھتا..............ان لمحات میں اس کا دل چاہتا کہ سورج اپنی اسی جگہ پر ٹھہر جائے اور وہ یونہی سدا چلتی رہے...........نہ اس کا راستہ ختم ہو اور نہ وہ چلنے سے باز آئے ....اسے مشرق سے ابھرتے ہوئے نوخیز سورج کا منظر بہت اچھا لگتا تھا جو اس کے دل کو بھا جاتا۔علی الصبح ہی مشرقی برف پوش پہاڑیوں کی چوٹیوں سے سورج تانک جھانک شروع کر دیتا تھا............ پہلے وہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر پیلاہٹ بکھیرتا تھا...............اور پھر سورج کی کرنیں ہولے ہولے نیچے آنے لگتیں اور پھر اس کے گاؤں تک اتر آتی تھیں...............اس کا ذہن اکثر سورج کی طرف متوجہ ہو جاتا تھا..............اسے بعض اوقات اپنی درسی کتاب میں ''اللہ کی نعمتیں'' کے مضمون میں لکھا ہوا ایک جملہ یاد آ جاتا تھا۔

''سورج، چاند سب اللہ نے بنائے ہیں.......... یہ سب اللہ کی نعمتیں ہیں'' ....وہ گہری سوچ میں پڑ جاتی کہ اللہ نے سورج اور چاند کس طرح بنا لیے ہیں؟ یہ سوال متعدد بار اس نے دادی اماں سے بھی پوچھا تھا، مگر وہ اسے مطمئن نہ کر پائی تھیں...............دادی اماں کا یہی جواب ہوتا تھا کہ اللہ نے سب چیزیں اپنی قدرت کاملہ سے پیدا کی ہیں...............لیکن اللہ کی قدرت کیا ہوتی ہے؟ اس کا مفہوم نگارش کے ذہن میں کچھ نہ آتا...............وہ سوچتی کہ آخر اللہ تعالیٰ ہیں کون؟؟..........جنہوں نے اتنی ساری چیزیں بنالی ہیں!!...............پھر نگارش کو اللہ تعالیٰ کی کتاب ''قرآن مجید'' یاد آ گئی..........اس نے سوچا ضرور اللہ تعالیٰ نے جو کتاب لکھی ہے اس میں زمین آسمان، سورج، چاند سب چیزوں کا ذکر ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کس طرح بنائی ہیں؟

..........پھر اسے خیال آیا کہ قرآن مجید تو عربی میں لکھی ہوئی

کتاب ہے، اور...............اور...............وہ تو عربی زبان نہیں جانتی .... یہ سوچ کر اس کا دل دکھ سے بھر گیا کہ اسے عربی زبان کیوں نہیں آتی؟؟...............پھر اسے اللہ تعالیٰ سے شکوہ پیدا ہو گیا کہ جب اللہ تعالیٰ جانتے تھے کہ مجھے عربی زبان نہیں آتی تو پھر انہوں نے اپنی کتاب اردو میں نازل کیوں نہیں کی؟..............عربی میں کیوں نازل کر دی!!...............وہ سوچتی کہ کبھی نہ کبھی وہ اللہ تعالیٰ سے ضرور ملے گی اور سب سے پہلے یہی سوال کرے گی کہ انہوں نے اپنی کتاب اردو زبان کے بجائے عربی میں کیوں لکھ دی؟...............وہ سکول میں ہمیشہ تفریح کے وقت نابی کے ساتھ کھیلتی تھی، مگر آج نہیں کھیلی تھی...............اس کے دل میں دکھ اور درد بھرا ہوا تھا...........وہ تفریح کے وقت سکول کے میدان سے باہر جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ گئی تھی اور روتی رہی تھی۔اس کے دل کا دکھ مٹ نہیں رہا تھا..........بس جی میں یہی آتا تھا کہ ہمیشہ روتی رہوں..............تفریح ختم ہو گئی..............مگر وہ اپنی کلاس میں نہ آئی ....

پھر نابی اور میڈم اسے تلاش کرتے ہوئے جھاڑیوں تک آ پہنچیں...............وہ اسے آوازیں دے رہی تھیں مگر وہ بولی تو نہ، لیکن چپکے سے جھاڑیوں سے باہر نکل آئی۔میڈم نے اسے بہت ڈانٹا بھی اور پوچھا بھی کہ وہ رو کیوں رہی تھی؟ مگر وہ کچھ جواب نہ دے پائی...............وہ بہت سوچتی رہی، مگر اسے مطلق سمجھ نہ آئی کہ وہ اپنے دل کی حالت اور دکھ کو کس طرح بیان کرے!!...........

آج جب وہ سکول سے گھر واپس آئی تھی تو اس وقت بھی اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے..............اماں نے بھی اسے دیکھ کر تشویش کا اظہار کیا تھا اور پھر لاڈ کرتے ہوئے اسے کھانا لا کر دیا تھا، جو چٹنی، لسی، دیسی ساگ اور گھر کے تندور سے پکی ہوئی روٹی پر مشتمل تھا۔کھانا کھانے کے بعد امی نے اس سے پوچھا تھا۔

''بیٹی!..........کیا اپنی کاپی آج لے آئی ہو؟''

اچانک کاپی کے متعلق پوچھنے پر وہ سٹپٹا گئی اور پھر ڈرتے ڈرتے ہوئے امی کے قریب ہوتے ہوئے بولی۔

''امی!...............میں نے ان پیسوں کی چاکلیٹ لے کر نابی کو دے دی تھیں''۔''کیوں لے کر دی ہیں..........کاپی کیوں نہیں لائی تم؟...............''ماں نے اسے ڈانٹا۔

''امی!...............میڈم نے ہمیں پڑھایا تھا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے

ہیں ’’ہمیں دوسروں کے کام آنا چاہیئے‘‘ .... یہ سن کر ماں نے اس کے گرد اپنا بازو حمائل کر کے پیار کیا اور کہا.................. ’’اس طرح دوسروں کے کام نہیں آیا جاتا۔ کل کاپی لے کر ضرور آنا تاکہ اپنا ہوم ورک کر سکو‘‘۔

..............آج رات کو سوتے وقت اس کا ذہن پھر الجھ کر رہ گیا تھا کہ دوسروں کے کام کس طرح آیا جا سکتا ہے؟؟ .... کیا کوئی چیز خرید کر دوسروں کو دینا، دوسروں کے کام آنا نہیں ہے؟ .... لیکن رات کو جب وہ بستر پر لیٹی تھی تو اس کے دل میں ایک دن پہلے کے واقعے سے پیدا ہونے والی گہری کسک اور اضطراب بیٹھا ہوا تھا............ جو اسے آج دوسرے دن بھی رلائے جا رہا تھا۔ جس سے وہ بہت مضطرب اور پریشان تھی................ اور اچانک رات کے آخری پہر جاگ پڑتی تھی.......... گزشتہ رات بھی وہ یوں ہی جاگ کر روتی رہی تھی اور آج پھر رو رہی تھی.............. لیکن اس کا دکھ اور اضطراب کسی کو بھی سمجھ نہ آ رہا تھا................ اور اس کی بات میں کسی کو دکھ کا کوئی عنصر بھی نظر نہ آ سکا تھا............. روتی ہوئی ننھی نگارش کے دل میں کئی سوال ابھر رہے تھے۔ دادی اماں سوئی ہوئی تھیں................ وہ بھی اگر اسے کچھ ڈھارس دے دیتیں تو اس کا دل سنبھل جاتا................، لیکن دادی اماں کے نزدیک جو واقعہ وہ بیان کرتی تھی اس میں دکھ کی کوئی بات ہی نہ تھی..................

دو دن پہلے جب وہ اپنی ہم جماعتوں کے ساتھ تفریحی ٹور پر گئی تھی اور یہ لوگ تین چار شہروں میں گھوم پھرے تھے.............. ایک جگہ انہوں نے شام کو آرام کیا کہ ان کی سکول بس کے قریب ایک چمکتی دمکتی کار آ کر رکی۔ جس میں دو تین بچے اپنی امی ابا کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ بچے گاڑی میں اچھل کود کر رہے تھے کہ ایک بچے کا کھلونا اچانک نیچے گر پڑا................ پاس ہی بیٹھی بھکارن عورت کا ایک بچہ جو دھول مٹی میں ادھر ادھر شرارتیں کرتا بھاگتا پھر رہا تھا، نے تیزی سے وہ کھلونا اٹھا کر کار میں سوار بنے ٹھنے بچے کے ہاتھ میں تھما دیا................ اس بھکارن نے اپنے بچے اور کار میں بیٹھے بنے ٹھنے بچے کی طرف دیکھا تو ننھی نگارش کو بھکارن اور اس کے میل کچیل میں اٹے ہوئے بچے میں ایسی تاسف بھری متضاد سوالیہ علامت نظر آئی جسے وہ کسی بھی طرح بیان نہ کر سکتی تھی.......... بھکارن کا بچہ کھلونا اٹھا کر دینے کے بعد نہایت سرعت سے پلٹا جیسے چمکتی کار کے قریب کھڑا ہونا جرم ہو اور پھر اپنی ماں کے بازوؤں میں جھول گیا

.................نگارش نے جب دوبارہ بھکارن کے بچے سے نظریں ملائیں تو اس کے چہرے پر اسے ایسا گہرا دکھ و محرومی اور بے توقیری نظر آئی جس نے اس کے دل میں الم و تاسف کا ایک ناقابل بیان تیز نشتر چبھو دیا................ نگارش نے بے اختیار رونا شروع کر دیا.................. اسے یوں روتا دیکھ کر اس کی ٹیچرز اور سب ہم جماعت اس کے گرد جمع ہو گئے................ ٹیچرز نے بڑے پیار کے ساتھ اس سے رونے کا سبب دریافت کیا، مگر وہ کچھ بھی نہ بتا سکی۔ اس وقت اس کے دل میں اللہ سے ملنے اور شکوے کرنے کا شدید جذبہ پیدا ہو گیا۔ اس نے اسی وقت دل میں مستحکم تہیہ کر لیا کہ وہ اللہ تک پہنچنے کی ہر حال میں کوشش کرے گی................. وہ ہر ایک سے اللہ تعالیٰ کے بارے میں پوچھتی رہے گی اور................ آخر ایک دن کوئی نہ کوئی اسے اللہ تعالیٰ کے بارے میں بتا ہی دے گا................ اور.............. اور.......... جب اللہ تعالیٰ اسے مل گئے تو وہ ان سے بے حساب شکوے کرے گی................ بے شمار باتیں پوچھے گی، اپنے دل کا دکھ بھی بیان کرے گی................ یہ بھی پوچھے گی کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی ذات سے دور کیوں کر دیا تھا ....وہ اللہ تعالیٰ سے ایسی باتیں بھی پوچھ لے گی جو کسی کی سمجھ میں نہ آتی تھیں کیونکہ اللہ تعالیٰ تو ہر بات خوب سمجھتے ہیں نا................ اور................ آخر پر وہ شکایات کا دفتر کھول کر رکھ دے گی............... اس سوچ کے ساتھ ہی ننھی نگارش ہچک ہچک کر روتے ہوئے نڈھال ہو گئی اور پھر نہیں معلوم کس لمحے اسے نیند نے اپنی آغوش میں لے لیا۔

☆☆☆☆☆

تصویری میڈیم

برف پوش وادیوں میں رہنے والے ایک نوجوان کی روئیداد حیرت، جس کا غیر ارادی طور پر ذہنی رابطہ سینکڑوں میل دور رہنے والی ایک لڑکی سے ہو گیا تھا۔ غیر ارادی ٹیلی پیتھی کے ذریعے ہونے والے تعارف کے بعد شادی کے بندھن میں بندھ جانے والے ایک جوڑے کا حیرت انگیز احوال)

کاشف رات بھر کے سفر سے صبح فجر کی اذانوں کے وقت اپنے گاؤں پہنچا تو اس کی بیوی ''پروین'' جاگ اٹھی تھی اور ناشتہ تیار کر رہی تھی۔ کاشف ناشتہ کرنے کے بعد سفر کی تکان کی وجہ سے ایسی لمبی تان کر سو گیا کہ دوپہر کے وقت جاگنے کے بعد پلنگ پر لیٹے لیٹے سوچا کہ اس نے سوچا کہ پروین تو شام چار پانچ بجے تک ہی گھر آئے گی..............اس نے ارادہ کیا کہ پہلے وہ اٹھ کر نہا دھو لے پھر کھانا بنائے گا..............کاشف گاؤں کے ہائی سکول میں سینئر ٹیچر تھا اور اس کی بیوی پروین بنک میں آفیسر تھی، جو روز صبح شہر چلی جاتی اور پھر رات کو گھر واپس لوٹتی تھی

............کاشف نے اس کی گھر کی ذمہ داریاں کم کرنے کے لیے اور اسے سہولت بہم پہنچانے کے لیے کئی کام اپنے ذمے لے لیے تھے۔ کیونکہ کاشف کے گھر کے قریب ہی گاؤں کا ہائی سکول تھا اور کاشف سکول سے چھٹی کے بعد سیدھا گھر ہی آجاتا تھا..............جبکہ پروین کو بنک سے چھٹی کے بعد گھر کے لیے طویل سفر کرنا پڑتا تھا..............کاشف گزشتہ دس دنوں سے ایک محکمانہ تعلیمی ورکشاپ کے سلسلہ میں لاہور میں ٹھہرا رہا تھا..............اور رات گزر جانے کے بعد آج فجر کے وقت گھر پہنچا تھا..............ابھی وہ پلنگ پر ادھیڑ بن میں ہی تھا کہ اسے یاد آیا کہ صبح جب وہ نیم غنودگی میں تھا تو پروین نے اس سے کچھ بات کی تھی..............جو اسے پوری

طرح یاد نہ آ رہی تھی۔ چنانچہ اس نے ذہن پر زور ڈالا تو اسے یاد پڑا کہ پروین نے کہا تھا کہ:

''آج بنک کا ہاف ڈے ہے..............اور وہ بنک سے جلدی چھٹی کرے کچھ شاپنگ کرے گی..............کاشف کے لیے نئے جوتے بھی خرید لائے گی..............'' وہ ''ہوں ہوں'' کر کے چپ ہو گیا تھا..............

..............گھر کے لیے سامان کی خریداری..............حتیٰ کہ کاشف کے لیے جوتے اور لباس وغیرہ تک پروین ہی خریدتی تھی..............کاشف کو سیاہ رنگ کے جوتے پسند تھے

..............لیکن اس بار کاشف نے دل میں سوچا تھا کہ وہ براؤن رنگ کے جوتے پہنے گا، لیکن وہ اپنی اس پسند اور خواہش کا اظہار پروین سے نہ کر پایا تھا..........اسے افسوس ہوا کہ وہ اس بات کا تذکرہ پروین سے کیوں نہ کر پایا..............اور اب پروین سیاہ جوتے اس کے لیے خرید کر لے آئے گی..............چنانچہ اس نے پروین کے موبائل پر رابطہ کرنا چاہا تا کہ اس کو بتا دے کہ وہ اس کے لیے براؤن رنگ کے جوتے خریدے..............لیکن اس کا موبائل بند مل رہا تھا یا پھر شاید سگنل شارٹ تھے..............اگر پروین گھر آ رہی تھی تو راستے میں اکثر موبائل سگنل نہیں آتے تھے..........اس نے دو تین بار کوشش کی کہ پروین سے رابطہ ہو جائے، لیکن ایسا نہ ہو سکا

..............۔

..............کاشف اٹھ کر نہایا..............لباس تبدیل کرنے کے بعد کھانا تیار کیا تو اس وقت پروین کا فون موصول ہوا کہ وہ آدھے گھنٹہ تک گھر پہنچ جائے گی..............

..............پروین کے گھر پہنچنے پر جب دونوں کھانا کھا چکے تو پروین نے اسے جوتوں کا ڈبہ کھول کر جوتے دکھائے تو کاشف حقا بقارہ گیا..............پروین نے معمول سے ہٹ کر کاشف کے لیے براؤن رنگ کے جوتے خریدے تھے۔ پروین نے اسے بتایا کہ ''وہ کاشف کے لیے ہمیشہ سیاہ رنگ کے جوتے خریدتی تھی، لیکن اس بار اسے خیال آیا کہ وہ براؤن رنگ کے جوتے خریدے'' پھر اس نے استفہامیہ نگاہوں سے کاشف کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''پسند آئے یہ آپ کو؟''

''اوہ..............خدا..............میں نے تو تمہیں فون کرنے کی کوشش کی کہ میرے لیے اس بار براؤن رنگ کے جوتے خریدنا..............مگر تمہیں تو ہمیشہ میرے

دل کی بات کا پیشگی پتہ چل جاتا ہے...............''

کاشف نے محبت وممنونیت بھرے لہجے میں پروین کو مخاطب کیا۔

''ہاں...............میں آپ کے دل سے خوب واقف ہوں...............آپ کے دل میں اتر کر دل کا کونا کونا دیکھ ڈالا ہے۔آپ کی پسند اور ناپسند سب کچھ پڑھ لیا ہے...............''پروین کھلکھلا کر ہنستے ہوئے بولی تو کاشف مسکرا کر رہ گیا۔

...............یہ تقریباً سات سال پہلی بات تھی...............کاشف کو گاؤں کے ہائی سکول میں ٹیچر تعینات ہوئے چھ ماہ ہی گزرے تھے...............نو تعینات شدہ اساتذہ کی استعداد کا ربڑھانے کے لیے اکثر پیشہ ورانہ تربیتی ورکشاپس جاری رہتی تھیں۔کاشف ایک پانچ روزہ تربیتی ورکشاپ کے سلسلہ میں اسلام آباد گیا۔ورکشاپ کے اختتام پر حسب روایت ایک چھوٹی سی تقریب منعقد ہوئی،جس میں شرکائے ورکشاپ انفرادی اور گروپ فوٹو سیشن بھی ہوئے۔یہ تصاویر بعد میں ورکشاپ اٹینڈ کرنے والوں کو بھیج دی گئیں۔ایک دن سکول سے واپسی پر وہ اپنے بڑے بھائی کے کریانہ سٹور کے پاس سے گزرا تو انہوں نے اسے روک لیا۔گاؤں میں ان کا واحد کریانہ سٹور ہونے کی وجہ سے گاہکوں کا بے پناہ رش پڑا تھا اور اس پر مستزاد یہ کہ شہر سے منگوائے سازوسامان کی دو گاڑیاں لدی کھڑی تھیں،جن سے کاشف کے بھائی سامان اتروا رہے تھے۔ انہوں نے کاشف کو یہ کہہ کر سٹور پر بٹھایا کہ...............وہ ذرا سٹور سنبھالے وہ گاڑیوں سے مال اتروالیں...............''چنانچہ کاشف سٹور پر بیٹھ کر گاہکوں کو نمٹانے لگا...............کسی گاہک نے سگریٹ طلب کیے تو اس کے مطلوبہ برانڈ کے سگریٹ سٹور پر نہیں تھے............... کاشف نے بھائی سے پوچھا جو باہر کھڑے ایک لمبی سی فہرست ہاتھ میں پکڑے سامان گاڑیوں سے اتروا رہے تھے کہ...............فلاں برانڈ کے سگریٹ نہیں ہیں؟''

تو وہ مزدوروں کو مخاطب کر کے بولے کہ:

''اس برانڈ کے سگریٹ کا کاٹن سٹور میں رکھنے کے بجائے دوکان پر رکھ دو...............''چنانچہ مزدور مطلوبہ برانڈ کے سگریٹ کے دو کاٹن اٹھا لایا...............کاشف نے کاٹن کھول کر مطلوبہ برانڈ کے سگریٹ گاہک کو دیئے تو ساتھ ہی کاٹن سے سگریٹوں کے تشہیر کے لگ بھگ دو درجن اشتہار نکل آئے،جنہیں کاشف نے اٹھا کر کاؤنٹر پر رکھا دیا

...............اور کاٹن سے سگریٹوں کے پاکٹ نکال کر دوکان میں لگا دیئے...............گاہکوں کا رش ختم ہونے پر اس کی نظریں اشتہار پر پڑیں تو کاشف کے ذہن میں ایک جھما کا ہوا اور پھر ایک آواز دماغ میں گونجی...............''پروین''۔اس نے حیرانگی اور تجسس کے عالم میں اشتہار میں چھپی ماڈل لڑکی کی تصویر کو غور سے دیکھا تو اس کو ایسا لگا کہ وہ عرصہ سے اس لڑکی کو جانتا ہے ....اس کی آنکھوں میں اسے اپنائیت وانس کی واضح جھلک محسوس ہوئی...............

لیکن...............لیکن نہیں...............نہیں...............پتہ نہیں اس ماڈل کا تعلق کس ملک اور شہر سے ہے؟...............وہ بھلا اسے کس طرح جان سکتا ہے؟...............اس نے اپنے خیال کو جھٹکا اور دوکان پر آنے والے گاہکوں کی طرف متوجہ ہو گیا...............رات کو جب کاشف سونے کے لیے بستر پر دراز ہوا تو،ایک بار پھر دن کو دیکھی گئی اس ماڈل کا سراپا اس کے ذہن میں آ گیا...............اسے لگا جیسے وہ کاشف کو مخاطب کر رہی ہے...............

اور جب وہ غنودگی کی کیفیت میں پہنچا تو مدہم مدہم اسے ایک نسوانی آواز سنائی دی،جس کے ساتھ کچھ شوروغل بھی تھا۔

''آپ کا نام کاشف ہے؟؟...............میں پروین ہوں جی...............''

یہ مترنم نسوانی آواز اس کے دماغ میں پیدا ہوئی یا سماعت کے ذریعے سنائی دی۔کاشف کچھ نہ سمجھ سکا اور ہڑابڑا کر اٹھ بیٹھا...............کیا اس سے وہ ماڈل مخاطب ہو رہی ہے؟...............اس کی نیند اچاٹ ہو گئی...............وہ بہت غور کرتا رہا...............لیکن بات اسے سمجھ نہ آئی ....اور پھر اس نے تنگ آ کر اپنے ان خیالات اور اس آواز کو وہم و وسوسہ قرار دے کر جھٹک دیا...............وہ نیند کی وادیوں میں چلا گیا۔

...............بات اذکار رفتہ ہو گئی...............کاشف اس واقعہ کو بھول گیا۔کئی ماہ گزر گئے ....ایک رات جب کاشف سونے کے لیے بستر پر لیٹا تو نہ جانے کیوں اس پر غنودگی سی طاری ہوئی اور اس کی آنکھیں بند ہو گئیں تو پھر کئی ماہ پہلی والی آواز اسے اس طرح سنائی دی جیسے دماغ کے اندر سے پیدا ہو رہی ہے۔

''کل ''مری'' آ جانا جی...............میں بھی کل ''مری'' آ رہی ہوں...............''

اس بار یہ نسوانی آواز بہت واضح تھی...............کاشف کے دماغ

میں کئی ماہ پہلے سگریٹوں کے اشتہار پر چھپی ماڈل لڑکی کی تصویر گھوم گئی۔کیا وہ ماڈل کاشف کو پکارتی ہے؟..................کاشف کو کچھ سمجھ نہ آئی۔کاشف کا تجسس انتہا درجہ بڑھ گیا..................اس نے اپنے دل میں غیر اختیاری طور پر پروین کے لیے محبت کی ایک لہر محسوس کی..................وہ سوچتا رہا کہ وہ اس غیر مرئی آواز کے مطالبہ پر مری جائے یا نہ جائے؟..................پھر اس نے اپنے خیالات کو جھٹکا کہ کیا وہ پاگل ہے کہ مری چلا جائے..................لیکن پھر اس کے دل کے کسی نہاں خانے سے تمنا ابھرتی کہ آخری مری جانے میں ہرج ہی کیا ہے؟..................کل ہفتہ وار تعطیل تھی............اور مری کا علاقہ اس کے گاؤں سے کوئی زیادہ دور نہیں تھا..................اس طرح اس آواز کے اسرار سے بھی پردہ اٹھ جائے گا..................اور کچھ سیر و تفریح بھی ہو جائے گی..................دوسرے دن کاشف دن کے بارہ بجے کے لگ بھگ مری پہنچ گیا اور مری پہنچ کر مال روڈ پر وہ یوں ہی گھومنے پھرنے لگا..................لاسلکی آواز نے وضاحت تو نہ کی تھی کہ وہ مری کس جگہ جائے؟..................اس کا مدعا تھا کہ وہ دو اڑھائی گھنٹے مری میں گزار کر واپس چلا جائے گا۔وہ گھومتے گھامتے کچھ آگے بڑھا تو سامنے اس کی نظریں شیشہ کاری کے کام سے مزیّن ایک چمکتے ہوئے کیفے پر پڑیں..................جس کے بیرونی حصہ پر تیز سرخ رنگ کا پینٹ کیا گیا تھا۔اب اسے بھوک بھی لگ رہی تھی..................کیفے نے اس کی توجہ کھینچ لی اور وہ سیدھا اس میں چلا گیا..................کیفے میں کوئی درجن بھر مرد و خواتین بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے..................وہ نگاہیں دوڑاتے ہوئے ایک خالی میز کے گرد کرسی پر بیٹھ گیا..................ابھی چند ہی ساعتیں گزری تھیں کہ ایک لڑکی نے دروازے سے اندر قدم رکھا..................کچھ توقف کر کے ہال کا جائزہ لیا اور سیدھی اس کے ٹیبل کے پاس آ کر اس کے بالمقابل بیٹھ گئی..................

لڑکی کے چہرے پر تجسس تھا اور اس کی نگاہیں کسی کی متلاشی لگ رہی تھیں..................جونہی کاشف کی نگاہیں لڑکی کے چہرے پر پڑیں تو اسے سات ماہ قبل سگریٹوں کے اشتہار پر چھپی ماڈل کا چہرہ یاد آ گیا..................اس لڑکی کی آنکھیں بالکل ماڈل کی طرح تھیں اور چہرے میں حیران کن حد تک مماثلت تھی..................مگر یہ وہ ماڈل نہیں تھی..................لڑکی نے کاشف کو غور سے دیکھا کئی لمحے تجسس بھری نگاہوں سے دیکھا۔کچھ دیر بعد لڑکی کے دوسرے ساتھی بھی اندر آ گئے اور اس لڑکی کے ساتھ ایک ٹیبل کے گرد بیٹھ کر ہنسی مذاق میں مشغول ہو گئے۔

کاشف بھی اسی ٹیبل کی طرف رخ کر کے بیٹھ گیا۔اپنے ساتھیوں سے باتیں کرتے ہوئے یہ لڑکی بار بار کاشف کی طرف دیکھتی رہی۔اس کی نگاہیں تجسس اور حیرت سے بھری ہوئی تھیں..................کاشف کا چہرہ بھی حیرت و استعجاب میں ڈوب گیا۔وہ سوچ رہا تھا کہ کیا یہ واقعی وہی ماڈل لڑکی ہے،جس کی تصویر اس نے کئی ماہ قبل اشتہار میں دیکھی تھی اور جس کی آواز اس نے غنودگی میں سنی تھی..................اور..................اور..................کیا یہ وہی لڑکی ہے،جس کی دعوت پر وہ آج مری آیا ہے!!!..................کاشف خیالات میں کھو گیا اور محویت کے عالم میں اس کی نگاہیں بار بار ان لوگوں پر مرتکز ہو جاتیں..................وہ خیالات میں اس قدر مستغرق ہو گیا کہ اسے پتہ ہی نہ چلا کہ سامنے ٹیبل سے دو لڑکیاں اٹھ کر اس کے پاس آئیں اور اسے مخاطب کیا۔

''سنیے''

کاشف اچانک اس طرح ان لڑکیوں کے مخاطب کیے جانے پر بوکھلا گیا..................جی..................جی..................مجھ سے کچھ کہا آپ لوگوں نے؟

''جی آپ ہی سے کہا ہے،ایک لڑکی بولی۔''آپ ہماری طرف مسلسل دیکھے جا رہے تھے۔اب آپ کے پاس آ کر آپ کو آواز دی تو پتہ لگا کہ آپ تو اپنے حواسوں میں ہی نہیں ہیں''۔لڑکی نے شوخی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اچھا..................بات دراصل یہ ہے کہ..................''

''دراصل دراصل کچھ نہیں۔آپ کافی دیر سے ہماری ٹیبل کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے''

''جی..................معافی چاہتا ہوں''..................چلیے آپ کو معاف کر دیتے ہیں،مگر ایک شرط پر''۔دوسری لڑکی بولی۔

''وہ شرط کیا ہے؟''کاشف کچھ گھبرا کر بولا۔

''آپ کو اپنے بارے میں کچھ بتانا ہوگا''۔

''جی پوچھیے''

''آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟''۔

''میں کشمیر کے ایک گاؤں کا رہنے والا ہوں''۔کاشف نے مختصر سا جواب دیا۔

''کیا آپ کبھی اسلام آباد گئے ہیں''؟

''جی متعدد بار''

''آپ کیا کرتے ہیں اور اسلام آباد کیوں گئے تھے''؟

''میں ہائی سکول میں ٹیچر ہوں اور ایک تعلیمی ورکشاپ اٹینڈ کرنے اسلام آباد گیا تھا.................
مگر آپ یہ سب کیوں پوچھ رہی ہیں''؟

''آپ ہی معافی کے لیے اس شرط پر راضی ہوئے تھے''

''او..........ہاں.................''

''آپ یہاں اکیلے بیٹھے ہیں.................ہمارے ساتھیوں کے ساتھ آ کر کیوں نہیں بیٹھتے؟ کھانا ہمارے ساتھ کھائیے''لڑکیوں نے اسے اپنے ہمراہ کھانا کھانے کی دعوت دے دی۔

کاشف نے ان کی یہ پیشکش قبول کر لی۔ جس لڑکی نے زیادہ سوالات کیے تھے،اس نے کاشف کا تعارف اپنے ساتھیوں سے کروایا۔مگر اس دوران ماڈل سے مشابہت رکھنے والی لڑکی بالکل خاموش بیٹھی رہی۔

یہ سب ہنس مکھ اور دوستانہ طبیعت رکھنے والے لوگ تھے اور ایک بنک میں کام کرتے تھے..........کاشف نے ان لوگوں کے ساتھ کھانا کھایا۔رخصت ہوتے وقت ماڈل سے مشابہت رکھنے والی لڑکی نے اپنا تعارف کاشف سے کرواتے ہوئے کہا کہ''میرا نام پروین ہے ....ہم اگلے ہفتے پھر مری آئیں گے۔کیا آپ بھی آنا پسند کریں گے''؟

کاشف نے کہا''میں وعدہ تو نہیں کرتا مگر کوشش کروں گا.................اچھا آپ بتائیں کہ آپ ماڈلنگ کرتی ہیں''؟

''نہیں.................میں تو بینک میں کام کرتی ہوں.................میں نے کبھی ماڈلنگ کا سوچا ہی نہیں،مگر آپ نے یہ کیوں پوچھا؟''

''بس.................یوں ہی پوچھ لیا''

مری میں پروین سے ملاقات کے بعد کاشف کی حالت عجیب سی ہو گئی۔ پروین کا مسکراتا چہرہ ہر وقت اس کی نظروں کے سامنے رہتا اور ذہن پروین کے خیالوں میں گم رہتا ....حیرت انگیز بات یہ تھی کہ مری میں اس ملاقات کے بعد وہ نہ تو اسے کبھی خواب میں نظر آئی اور نہ ہی غنودگی میں اس کی آواز سنائی دی۔

اگلے ہفتے کاشف دوبارہ مری چلا گیا۔اسی کیفے میں اس کی ملاقات پروین اور اس کی سہیلی راحیلہ سے ہوئی۔سلام دعا کے بعد راحیلہ نے کہا۔

''پروین.................!ذرا وہ تصویر تو دکھاؤ''۔

راحیلہ کی بات سن کر پروین نے اپنے بیگ سے ایک بڑی تصویر نکالی۔یہ ایک گروپ فوٹو تھا ....تصویر پر نظر پڑتے ہیں کاشف نے پوچھا۔

''یہ تصویر آپ کے پاس کہاں سے آئی، یہ تو اسلام آباد میں ہونے والی ایک تعلیمی ورکشاپ کے شرکاء کا گروپ فوٹو ہے''۔

پروین،کاشف کی حیرت سے محظوظ ہوتے ہوئے بولی۔

''میرا بھائی عمران بھی اسلام آباد میں ہونے والی اس تعلیمی ورکشاپ میں شریک تھا اور وہی یہ گروپ فوٹو گھر لایا تھا.................گروپ میں اسے (کاشف کو) دیکھ کر ایسا لگا جیسے وہ اس لڑکے کو برسوں سے جانتی ہے۔وہ اپنے بھائی سے یہ تو نہ پوچھ سکتی تھی کہ یہ آدمی کون ہے؟ ....پھر ایک انجان شخص کو وہ کیسے تلاش کرتی!!!لیکن اسے مسلسل تصویر میں دیکھے گئے شخص کا خیال آتا رہا۔اس انجان آدمی سے اسے ایک انس سا ہو گیا اور اس کا سراپا اس کے ذہن سے چپک کر رہ گیا.................آخر الذکر پروین نے بتایا کہ اس نے اس شخص کو ذہن سے جھٹکنے کی حتی المقدور کوشش کی مگر نا کام رہی.................دو ہفتے پہلے اسے خواب نظر آیا کہ وہ کسی پہاڑی علاقے میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ گھوم رہی ہے اور وہاں اس کی ملاقات اس تصویر والے لڑکے سے ہوتی ہے''۔

کاشف پروین کی باتیں سن کر حیرت میں پڑ گیا.................پھر پروین نے مزید بتایا کہ ہماری برانچ کے لوگوں نے گزشتہ اتوار اچانک مری کی سیر کا پروگرام بنایا اور ہم سب لوگ مری آ گئے اور یہاں اس کیفے میں، میں نے آپ کو بیٹھا ہوا دیکھا تو مجھے فوراً اسی گروپ فوٹو والا چہرہ یاد آ گیا۔جب میری سہیلیوں نے آپ سے آپ کا تعارف پوچھا تو مجھے معلوم ہو گیا کہ ورکشاپ کے گروپ فوٹو میں وہ تصویر آپ ہی کی ہے۔چنانچہ میں نے دوبارہ آپ کو مری آنے کی دعوت دے دی۔

پروین کی باتیں سن کر کاشف کی حیرانی بڑھ گئی۔قصہ مختصر مری کے اس کیفے میں ہونے والی یہ ملاقات کاشف اور پروین کی شادی پر منتج ہوئی۔

...............پروین جوایک بینک آفیسرتھی،اس نے صرف کاشف کی تصویرہی دیکھی تھی اوروہ بھی محض اتفاقاً...............یہ تصویردیکھ کرپروین کوایسا کیوں لگا کہ یہی وہ شخص ہے، جسے اس کا جیون ساتھی بنناہے...............دوسری طرف کاشف کاماڈل کے فوٹو سے متاثرہونا،ماڈل اور پروین کی شکلوں میں مشابہت کی وجہ سے تھا؟ یاماڈل کافوٹوایک دوسرے کے لیے بنے ہوئے دودلوں کوملوانے کے لیےمحض ایک میڈیم بن گیاتھا...............؟؟

پروین کاشف کی مزاج آشناوخیال شناس ایک وفاشعاربیوی ثابت ہوئی ....کاشف اورپروین ایک دوسرے کوبےانتہاچاہتے ہیں۔کاشف کادل جوچاہتاہے، پروین بناکہےاپنے محبوب شوہرکے دل کی بات جان لیتی ہے۔کیایہ ٹیلی پیتھی کامظاہرہ ہے یا کچھ اور...............؟

کاشف اپنی شادی کے برسوں بعدبھی اس گتھی کونہ سلجھاسکاکہ پروین کے بھائی کے ذریعے کاشف کافوٹوپروین تک پہنچنا،ماڈل کی شکل وصورت کاپروین سے مشابہت رکھنا ....اورعین اس وقت کاشف کااپنے بھائی کے سٹورپرموجودہونا،جب سگریٹوں کے اشتہاروالاسامان گاڑی سے اتروایاجارہاتھا...............اورپھرپروین کی آوازکاغنودگی کے عالم میں کاشف کی سماعت سے ٹکرانا،حتیٰ کہ پروین کاوہی عمل کرناجوکاشف سوچتاہے،محض اتفاق ہے یا پھرذہن کاشدت سے ایک خیال پرمرتکزہونا...............کیایہ سب قدرت کے کسی مخفی نظام کا حصہ ہے؟ یاپھراتفاق سے زیادہ اس کی کچھ حیثیت نہیں...............

☆☆☆☆☆

اماں

اماں کی دعاکی تاثیرنے مجھےاردوسیکھنے کے قابل بنادیا
اورمیراکندذہن رواں ہوگیا۔میں بچپن میں اماں کی چادرکاکونہ پکڑے
رکھتاتھاکہ اماں اوجھل نہ جائیں،لیکن آج اماں
ہمیشہ کے لیےنظروں سےاوجھل ہوچکی تھیں۔

رحیم جان مزارپردعاکرتے کرتے آبدیدہ ہوگئیں،ان پرشدیدرقت طاری ہوگئی اور ان کی آنکھوں سے آنسوبہنے لگے...............وہ اپنے اکلوتے بیٹے کے ہاں اولادکی دعامانگنے دن بھرکاپیدل سفرکرکےاپنے بوڑھے پڑوسی میرلطیف کے ہمراہ منت ماناگیابکراساتھ لےکراس مزارپرآئیں تھیں...............رحیم جان جن کی پیدائش 1875 کےلگ بھگ ہوئی تھی اب 80 برس کی ہوچکی تھیں۔جنہوں نے ساری زندگی قضیوں،جفاؤں اورمصیبتوں میں بسرکی تھی۔ان پربیوگی کے دوران ایساکڑاوقت بھی آیاکہ چھ ماہ تک گھرسے باہرنہ نکل پائیں،کیونکہ ان کے پاس پرانے پھٹے ہوئے پیوندلگے جوڑے کےعلاوہ کپڑوں کادوسراکوئی جوڑانہیں تھا۔انہوں نے چھ ماہ گھرمیں ہی گزاردیئے تھے...............ان کے ہاں پیداہونے والے پانچ بیٹے ایک سال کی عمر تک پہنچنے سے پہلے ہی وفات پاگئے تھے۔بڑی دعاؤں سے چھٹے پیداہونے والے بیٹے کوخدانے زندگی دی تھی جس کی انہوں نے بڑی چاہت سے شادی کروائی لیکن وہ شادی کے چندماہ بعدلاولد ہی فوت ہوگیاتھااورسال بھرکے وقفے کے بعدان کی بہوبھی داعی اجل کولبیک کہہ گئی تھی ....رحیم جان کی تین بیٹیاں،جوبھائی کے بعدپیداہوئی تھیں،جب لڑکپن کی عمرکوپہنچیں تو رحیم جان کے خاوندبھی وفات پاگئے...............ان کے خاوندکی وفات کے چندماہ بعدان کوخدا نے ایک اوربیٹے سے نوازاتھا،جس کی شادی کوپندرہ برس ہوچکے تھےمگراس کے ہاں بچوں کو کلکاریاں مارتے دیکھنے کی رحیم جان کی آرزوپوری نہ ہوپارہی تھی...............وہ مزاروں پرمنتیں

اور دعائیں مانگتی پھرتی تھیں کہ ان کے اس بیٹے کے ہاں اولاد ہو جائے اور ان کی بہو کی گود بھر جائے ،لیکن خدا کی مصلحت وحکمت کہ ان کی آرزو کی کلی نہ کھل پا رہی تھی..................شکستہ حال اور غم و دکھ سے نڈھال بوڑھی رحیم جان نے مزار پر طویل دعا کے بعد اپنی چادر سے آنسوؤں سے تر چہرا صاف کیا اور گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر مزار سے اٹھ گئیں.....................

.................واپس گھر آتے ہوئے جب ان کے پڑوسی میر لطیف نے رحیم جان کو انتہائی غمزدہ پایا تو اس نے انہیں مشورہ دیا کہ ’’آپ اپنے بیٹے کی دوسری شادی کروا دیں.................شاید خدا کے ہاں آپ کی موجودہ بہو کی قسمت میں اولاد نہیں لکھی ہے...................‘‘ یہ مشورہ رحیم جان کو مناسب لگا...........لیکن مشکل یہ تھی کہ ایک سوکن پر اپنی بیٹی کون بیاہ دے گا..........؟..........وہ راستہ بھر سوچتی رہیں..........تو انکی نگاہ انتخاب اپنے دور کے رشتے میں بھتیجے جمد علی کی بیوہ بہو پر جا پڑی..........جو شادی کے تین برس بعد ہی بیوہ ہوگئی تھی..........رحیم جان نے دل ہی دل میں ارادہ کر لیا کہ وہ ضرور اپنے بھتیجے سے اشاروں کنایوں میں اس کی بیوہ بہو کے سلسلہ میں بات کریں گی تا کہ اس کی رائے معلوم ہو جائے۔

قضیوں کی ماری، حالات کی ستائی بیوہ رحیم جان کے بیٹے کو کوئی رشتہ دینے کے لیے تیار نہ تھا لیکن جمد علی کے لیے بھی اپنی جوان بہو کو گھر میں بٹھائے رکھنے کا کوئی جواز نہ تھا..........جمد علی کی بہو کے پانچ بھائی تھے۔وہ بھی اپنی بہن کی بیوگی پر پریشان تھے۔ چنانچہ ان سب لوگوں نے سوچ بچار کے بعد رحیم جان کو چند کڑی شرائط کے ساتھ اس رشتے کی ہاں کر دی اور یوں جمد علی کی بیوہ بہو دوسری بار بیاہ کر رحیم جان کی بہو اور پھر میری اماں بن گئیں..........بوڑھی رحیم جان کی دعائیں بارگاہ الٰہی میں قبول ہو گئی تھیں۔

اب اماں جس گھر میں آئی تھیں وہاں انہیں پہلے سے ہی ایک سوکن کا سامنا تھا۔لیکن دونوں میں بہت اتفاق و اتحاد تھا..........جو بدقسمتی سے چند ہی برس قائم رہ سکا..........ابا کی دوسری شادی پر میری سوتیلی ماں کے میکے والے ناراض ہو گئے تھے..........اور دونوں خاندانوں میں محاذ آرائی شروع ہو گئی تھی..........جس کے نتیجے میں میری سوتیلی اماں کو یہ گھر چھوڑنا پڑا۔

ابا اپنی سروس کے سلسلہ میں چھ چھ ماہ گھر سے باہر رہتے اور گھر میں ساس، بہو صرف دو عورتوں کو ضرورت کی کوئی چیز بھی لا کر دینے والا کوئی نہ ہوتا تھا۔اماں کا

میکا شہر میں تھا اور اماں سال ڈیڑھ سال بعد ہی اپنے میکے جا پاتیں۔

میں جب پانچ برس کا ہو گیا تو دادی اماں اور اماں مجھے سکول میں داخل کرنے کا سوچنے لگیں۔وہ آپس میں باتیں کرتیں اور میں سنتا رہتا۔ایک دن دوپہر کے وقت میں برآمدے میں بچھی چارپائی پر بیٹھا پھیری والے سے خریدا گیا پھونک مارنے سے بجنے والا باجا زور زور سے بجا رہا تھا۔میرے سامنے ہی اماں چولہے میں لکڑیاں جلائے توے پر مکئی کی روٹی پکا رہی تھیں اور پاس بیٹھی دادی اماں سے باتیں کرتی جاتی تھیں، نے مجھے ڈانٹا کہ زور زور سے باجا نہ بجاؤ لیکن وہ جتنا منع کرتیں میں اور زور زور سے باجا بجانا شروع کر دیتا..........میرے نہ ماننے پر اماں بیٹھے غصے سے بولیں..................

’’یہ دن بھر ہمیں تنگ کرتا رہتا ہے..........اب پانچ سال سے اس کی عمر نکل گئی ہے..........کل اسے جا کر سکول میں داخل کروائیں گے‘‘ پھر انہوں نے دادی اماں کو مخاطب کر کے کہا

’’اماں آپ کل اسے جا کر سکول میں داخل کروا دیں۔کب سے اس کا قاعدہ گھر میں پڑا ہے..................اب یہ تعلیم کی عمر سے نکلتا جا رہا ہے‘‘۔ اماں دادی اماں کو ’’اماں‘‘ کہہ کر مخاطب کرتی تھیں۔

میں نے سکول کا نام سن کر اپنا باجا پھینک دیا اور یکدم بولا..........

’’نہیں..........نہیں..........میں سکول نہیں جاؤں گا..........گھر پر ہی رہوں گا..........اب باجا کبھی نہیں بجاؤں گا..........مجھے سکول مت بھیجنا‘‘۔

میں سمجھا تھا کہ سکول میں مجھے باجا بجانے کی پاداش میں داخل کروایا جا رہا ہے..........سکول میرے نزدیک ایک ایذا خانہ تھا۔جہاں دادی اماں اور اماں نہ ہوں گی اور مجھے پڑھنے پر مجبور کیا جائے گا..........‘‘

اماں نے توے پر روٹی ڈال کر مجھے گھور کر دیکھا اور کہنے لگیں۔

’’ہاں..........تمہیں گھر بٹھائے رکھیں گے؟..........پڑھے گا نہیں تو؟ پھر دادی اماں بولیں۔ ’’بچہ جی..........کل صبح میں تمہیں سکول لے جاؤں گی۔توبہ..........سکول جانے سے انکار نہیں کیا جاتا..........تُو تو بہت

اچھا بچہ ہے.................تو نے دیکھا نہیں نادر علی کا بیٹا بھی سکول جاتا ہے................وہ تم سے تو چھوٹا ہی ہوگا''۔

دادی اماں کی باتیں سن کر مجھے یقین ہو گیا کہ وہ ضرور صبح مجھے سکول لے جائیں گی ....میں روہانسا ہو گیا، اور بولا''...........نہیں...........نہیں...........میں سکول ہرگز نہ جاؤں گا...........اور نہ ہی پڑھوں گا''۔

''کیوں نہیں پڑھے گا؟............تجھے تو ہم ضرور سکول بھیجیں گے''۔

اماں کی بات سن کر میں نے تپتی دوپہر میں چارپائی سے چھلانگ لگائی اور سرپٹ بھاگتے ہوئے کہا۔

''نہیں جاؤں گا سکول.................'' اور پھر باہر دور تک باہر کھیتوں میں دوڑتا ہوا نکل گیا۔

دوسرے دن صبح اماں نے مجھے خوب اچھا ناشتہ کروایا۔ قاعدہ بستے میں ڈالا اور پھر دادی اماں مجھے کسی طرح بہلا پھسلا کر گھر سے لے کر چل پڑیں..........میں کھیت کی منڈیر کے آخری سرے تک ان کے ساتھ چلتا رہا..........اور پھر..........پھر میں نے سوچا کہ اگر ایک بار میں سکول چلا گیا تو مجھے روزانہ سکول بھیجا جائے گا................کیونکہ سکول جانے والے بچے ہر روز سکول جاتے ہیں..........یہ بات ذہن میں آتے ہی میں نے سرپٹ گھر کی طرف دوڑ لگا دی اور دادی اماں وہیں کھڑی حقا بقا رہ گئیں...........

گھر پہنچا تو اماں نے مجھے غصہ سے گھورا لیکن بولیں کچھ نہیں.........میں سمجھا شکر ہے، سکول سے جان بچ گئی، لیکن مجھے کیا پتہ تھا کہ مجھ پر چند ساعتوں کے بعد کیا بیتنے والی ہے۔ اماں نے خاموشی سے ایک پتلی سی لچکدار چھڑی اٹھائی اور میری پنڈلیوں پر ہلکی سی ضرب لگا دی ....اور پھر سخت ڈانٹا کہ ''سکول جاؤ۔ اگر نہ جاؤ گے تو مزید پیٹوں گی..............'' بادل نخواستہ مجھے دادی اماں کے ساتھ سکول جانا پڑا................سکول میں جا کر میں بہت حیران ہوا۔ میری طرح بہت سے بچے سکول میں تھے، جن کی ناکیں بہہ رہی تھیں، منہ میلے تھے، بال دھول مٹی سے آلودہ تھے اور قمیضوں کے دامن اور آستینیں میل کچیل سے اٹی ہوئی تھیں۔ دادی اماں سے ماسٹر صاحب نے کچھ باتیں پوچھیں۔ رجسٹر پر کچھ لکھا اور پھر دادی

اماں نے مجھے بتایا کہ اب میں سکول میں داخل ہو چکا ہوں۔ جب چھٹی ہوئی تو دوسرے بچوں کے ساتھ گھر آجانا...............لیکن میں نے رونا شروع کر دیا کہ دادی اماں آپ بھی سکول میں رہیں گی تو پھر میں رہوں گا۔ طوہاًو کرہاً دادی اماں میرے پاس کرسی پر بیٹھیں اور مجھے نیچے دھول میں اٹی ہوئی ٹاٹ پر بچوں کے ساتھ بٹھا دیا۔ پھر وہ مجھے گھنٹہ بعد گھر لے آئیں۔ تقریباً ایک ہفتہ وہ میرے ساتھ سکول جاتی رہیں اور پھر خدا خدا کر کے میں نے تنہا سکول جانا شروع کر دیا............

......پھر میرے لیے ایک اور شدید مسئلہ پیدا ہو گیا..................مجھے اردو قاعدے کے حروف تہجی یاد نہ ہوتے تھے۔ گھر آکر میں اماں سے جو پرائمری تک پڑھی ہوئی تھیں، پوچھ کر سکول میں پڑھائے گئے اردو قاعدہ کے الفاظ یاد کرتا مگر ایک ایک گھنٹہ کی کوشش کے باوجود مجھے ایک حرف بھی یاد نہ ہو پاتا۔ جب میں لفظ دہراتے دہراتے ایک آدھ منٹ کا توقف کرتا تو وہ لفظ پھر بھول جاتا جس کی میں نے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ رٹنے کی مشق کی تھی۔ میں پھر روہانسا ہو کر اماں سے وہ لفظ پوچھتا ....دراصل میں سمجھتا تھا کہ حروف بس ''حروف'' ہوتے ہیں۔ کتاب کے حروف کو میں اسطرح سمجھتا تھا جیسے کہ چیونٹیوں کے ریلے میں سب ہی چیونٹیاں ہوتی ہیں۔ لیکن یہاں مسئلہ یہ پیدا ہو گیا تھا کہ ہر حروف کے الگ الگ نام رکھ دیئے گئے تھے۔ مجھے ان حرفوں کے نام رکھنے والوں پر غصہ آتا، جنہوں نے یہ مصیبت کھڑی کر دی تھی۔ ''ع، غ'' کے الفاظ میں بہت زیادہ بھول جاتا۔ مجھے یاد نہ رہتا کہ اسطرح کے حرف کا نام ''غین'' ہے.................پھر میں سوچتا اس کا نام اتنا مشکل کیوں رکھا ہے؟ کوئی آسان سا نام رکھ لیا جاتا.................بہر حال اماں نے مجھ پر بے پناہ محنت کی۔ وہ دن میں سینکڑوں بار مجھے بھولنے والا حرف بتاتیں اور کبھی بھی نہیں ڈانٹا، بلکہ میرا خیال تھا کہ وہ دل ہی دل میں پریشان تھیں کہ ان کا بیٹا کند ذہن ہے۔ جسے جلدی سبق یاد نہیں ہوتا...............میں پورے سال میں آدھا قاعدہ بھی یاد نہ کر پایا۔ جب لفظ رٹ رٹ کر بھی مجھے یاد نہ ہوتے اور بھول جاتے تو میں تنگ آجاتا...............چیختا کہ ''مجھے یہ یاد نہیں ہو رہا'' تو اس وقت اماں زیر لب کچھ پڑھ کر مجھ پر پھونکتیں اور وہ لفظ دوبارہ بتاتیں جو میں بھول گیا تھا۔ پھر تھوڑی سی کوشش کرتا تو وہ لفظ مجھے ازبر ہو جاتا۔ اگر اماں گھر میں مجھے پڑھانے والی نہ ہوتیں تو شاید دنیا کا کوئی بھی ماہر تعلیم مجھے کسی طرح بھی نہ پڑھا سکتا اور آج میں چٹا ان پڑھ ہوتا۔ میں جب لیٹ کر قاعدے کے الفاظ یاد کر رہا ہوتا اور دہراتے دہراتے لفظ مجھے

بھول جاتا،تواماں کام کاج کے دوران بلند آواز میں مجھے بتادیتیں کہ ''بھولنے والا لفظ یہ تھا''۔

اماں کی مسلسل محنت،توجہ اور فیضان سے دوسرے برس مجھے اردو قاعدہ فرفر یاد ہوگیا۔ ....قاعدہ کا امتحان پاس کرنے کے بعد میرے لیے اردو کی پہلی کتاب لائی گئی۔سکول میں امتحان کے بعد چھٹیاں تھیں۔اماں نے مجھے گھر پر ہی اردو کی پہلی کتاب پڑھانا شروع کردی ....میں ہرروز ایک صفحہ یاد کرلیتا۔اس کے چوتھے صفحے پر ایک نظم تھی:

''آؤ بچوں سنو کہانی ایک تھا راجہ ایک تھی رانی
راجہ بیٹھا بین بجائے رانی بیٹھی گانا گائے
نوکر لے کر حلوہ آیا طوطے کا بھی جی للچایا

یہ نظم مجھے بہت اچھی لگی کیونکہ پہلی کتاب کے اس صفحے پر راجہ،رانی طوطے اور نوکر کی تصویر بھی تھی۔نوکر نے پلیٹ میں حلوہ اٹھا رکھا تھا۔چند ہی دنوں میں غیر ارادی طور پر یہ نظم مجھے ازبر ہوگئی۔ایسی یاد ہوئی کہ آج پینتیس سال گزرنے کے باوجود اس کا شاید ایک آدھ شعر بھی نہیں چھوٹا۔اور میں سمجھتا ہوں کہ آج اردو پر جتنا عبور مجھے حاصل ہے،یہ سارا اماں کی دعا کا ثمر ہے۔ اماں کی دعا نے میرا ذہن ایسا رواں کردیا کہ اردو زبان کا ہر مشکل مرحلہ میں بآسانی عبور کرتا چلا گیا............... جب میں پہلی کے بعد دوسری جماعت میں پہنچا تو یہاں پھر ایک نئی مصیبت آن کھڑی ہوئی۔مجھے بعض نو اورد لفظوں کا مفہوم نہ آتا تھا۔چونکہ یہ الفاظ میری مادری زبان سے بالکل نامانوس تھے۔میں دوسری جماعت کی اردو کی کتاب میں ایک کہانی پڑھ رہا تھا۔جس میں لفظ ''چنانچہ'' بار بار آرہا تھا...........میں اس لفظ کو ''چنا........... نچے''یعنی الگ الگ کرکے پڑھتا تھا۔کہانی پڑھتے ہوئے بار بار اس لفظ کا آنا مجھ پر بہت شاق گزرا۔مجھے سمجھ نہ آتی کہ چنا درمیان میں آکر کہاں سے ناچنے لگا؟۔۔۔ایسے مسئلوں پر بھی اماں نے میری رہنمائی کی۔اماں نے مجھے بتایا کہ ''یہ لفظ چنا........... نچہ نہیں بلکہ ''چنانچہ'' ہے''لیکن میری تسلی نہ ہوئی...............میں نے اماں سے پوچھا۔ ''چنانچہ لفظ یہاں کیوں لکھا جاتا ہے؟چنانچہ کا کوئی مفہوم میرے ذہن میں نہ بن رہا تھا...........اماں معاملہ کو بھانپ گئیں۔چنانچہ انہوں نے مجھے مادری پہاڑی زبان کا ایک لفظ بتایا ''جَڑِیّں''۔یعنی چنانچہ کا مطلب ''جَڑِیّں'' ہے۔ جَڑِیّں کا عین اردو متبادل تو شاید کوئی لفظ نہیں...............تاہم اردو زبان میں اس کی وضاحت

اور مفہوم ''یوں کہ،ایسا ہوا،یوں سہی،ایسے ہی،اس طرح'' کے الفاظ پورا کرتے ہیں۔''چنانچہ'' بھی یہی مفہوم ادا کررہا ہے۔لیکن یہ پہاڑی لفظ ''جَڑِیّں'' کا قائم مقام نہیں۔بہرحال اماں کی وضاحت پر مجھے بات خوب سمجھ آگئی۔پھر دوران تعلیم اردو کے مضمون میں،میں ہمیشہ اپنی کلاس میں سب سے لائق رہا۔یہ سب اماں کی دعا تھی۔یا فیض وتوجہ تھی کہ پانچویں کلاس میں پڑھنے کے دوران اردو گرائمر کی ایک بہت موٹی کتاب میرے ہاتھ لگ گئی۔میں نے تھوڑا تھوڑا کرکے اسے پڑھ لیا اور مجھے سینکڑوں محاورے اور ضرب الامثال زبانی یاد ہوگئیں...............اماں بیاہی تو شہر سے گئی تھیں،لیکن بیس پچیس برس دیہات میں گزار کر ٹھیٹھ دیہاتی بن گئی تھیں۔وہ اسوج کے مہینے میں گھاس بھی کاٹتی تھیں۔انہوں نے بڑی مشکل سے گھاس کاٹنے کا طریقہ سیکھا تھا۔درانتی خود تیز کرلیتی تھیں۔اماں کو میکے والوں نے کاڑھنا پرونا بھی سکھایا تھا۔اماں کے پاس کڑھائی سلائی اور سویٹر زوغیرہ کے ڈیزائن کی جہازی سائز کی ایک بہت بڑی کتاب تھی۔جسے وہ میکے سے اپنے ہمراہ لائی تھیں۔اس کتاب کو انہوں نے سنبھال کر گھر میں لکڑی کی واحد ساٹھ ستر برس پرانی الماری میں رکھا ہوا تھا۔سردیوں کے موسم میں انہوں نے اون سے میرے لیے سویٹر بننے کا ارادہ کیا اور کتاب اٹھا کر چولہے کے آگے بیٹھ کر سوئیٹر کا ڈیزائن سلیکٹ کرنے لگیں۔انہوں نے بہت سے ڈیزائن دیکھے اور پھر ایک ڈیزائن منتخب کرکے کاغذ تھوڑا سا موڑ کر کتاب بند کرکے بخاری پر رکھ دی...........اور کسی کام کی غرض سے اٹھ کر باہر چلی گئیں۔باہر شدید برف باری ہورہی تھی ....میں اور میرا چھوٹا بھائی احمد چولہے کے آگے بیٹھے آگ تاپ رہے تھے۔اماں کو نہ پاکر بھائی نے رونا شروع کردیا...............میں نے اسے چپ کروانے کی خاطر بخاری پر رکھی کتاب اٹھائی اور ایک ورق پھاڑ کر چولے میں پھینک دیا...............کاغذ سے شعلہ بھڑکا تو احمد چپ ہوگیا۔ایک کاغذ کو جلتے جب احمد نے دیکھا تو وہ پھر رو رو کر دوبارہ چولھے میں کاغذ جلانے کا مطالبہ کرنے لگا۔میں ایک ایک ورق پھاڑ کر چولہے میں جلاتا رہا...............اور جب اماں واپس آئیں تو کتاب کے چند ہی اوراق باقی بچے تھے...............میں ڈرا کہ اب اماں مجھے نہیں چھوڑیں گی...............لیکن اماں نے ایک لفظ تک نہ کہا...........اور کتاب کے وہ چند صفحات مجھ سے لے کر دوبارہ الماری میں رکھ دیئے۔ بچپن میں اماں سال میں تقریباً ایک بار ہمیں ساتھ لے کر اپنے میکے جاتی تھیں۔میری نانی امی اور نانا جی تو اماں کے

لڑکپن میں وفات پا گئے تھے،لیکن اماں سے بڑے پانچ بھائی تھے،جن میں سے چار بزنس کے شعبہ سے وابستہ تھے اور سب سے بڑے بھائی پاکستان ریلوے میں آفیسر تھے۔اماں کے بھائی پاکستان بننے سے قبل بیل گاڑیوں پر سری نگر سے تجارتی سامان راولپنڈی لاکر فروخت کرتے تھے۔1947 میں کشمیر کے مہاراجہ کے غاصبانہ قبضہ کے خلاف کشمیر پر قبائلیوں کے لشکر کے حملے کے وقت اماں کے بھائیوں نے اپنا بیل گاڑیوں کا تجارتی سامان بڑی مشکل سے گھر پہنچا کر سٹور کرلیا تھا.............اماں بتاتی تھیں کہ کشمیری چاولوں کی بوریوں سے ایک کمرہ بھر گیا اور پورے محلے میں دور دور تک چاولوں کی خوشبو پھیل گئی تھی.............اماں یہ بھی کہتی تھیں کہ ”وادی کشمیر کے چاول کا ذائقہ دنیا بھر میں کسی چاول میں نہیں ہے۔اسی طرح کشمیر کے سیب کا ذائقہ بھی دنیا کے کسی خطے کے سیب میں نہیں ہے“۔

اماں جب بچپن میں مجھے میکے لے جاتیں تو میں ایک لمحہ کے لیے بھی اماں کو جدا نہ ہونے دیتا تھا۔مجھے خدشہ تھا کہ اماں کہیں گم نہ ہو جائیں۔اماں کے میکے والے محلّہ میں مکان سے مکان جڑا ہوا تھا۔یہ اماں کی جنم بھومی تھی۔اور سب لوگ اماں کو جاننے والے تھے۔میں سمجھتا تھا کہ اگر میں اماں سے الگ ہوا تو اماں کسی نہ کسی گھر میں گھس جائیں گی تو میں انہیں کہاں ڈھونڈتا پھروں گا..........دوسرا ایک ٹھیٹھ دیہاتی بچے کے شہر میں پہنچ کر اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔اس پر گھبراہٹ طاری ہو جاتی ہے۔وہ بجلی کے قمقمے دیکھتا ہے۔آدمیوں کی ریل پیل دیکھتا ہے۔ گاڑیوں کا اژدھام دیکھتا ہے.........یہ سب چیزیں گاؤں میں نہیں ہوتیں۔ہمارے گاؤں میں تو بہت کم لڑکوں نے گاڑی کو قریب سے دیکھا تھا۔جب یہ حالت ہو تو شہر میں جا کر سخت گھبراہٹ ہوتی ہے۔گاؤں میں آدمی بعض اوقات کئی دنوں بعد کوئی دوسرا چہرہ دیکھتا ہے۔لیکن شہر میں تو صورت حالی یکسر مختلف ہوتی ہے...............میں اماں کے ساتھ ہر وقت ڈرا سہا چمٹا رہتا۔ جب وہ ایک گھر سے دوسرے گھر میں جاتیں تو میں ان کی چادر کا کونا پکڑ لیتا۔جس پر اماں کے میکے کی عورتیں میرا مذاق اڑاتیں،لیکن میں کسی بھی طرح اماں کی چادر کا کونا چھوڑنے پر رضا مند نہ ہوتا۔اگر اماں کہیں نظروں سے اوجھل ہو جاتیں تو میں رو رو کر آسمان سر پر اٹھا لیتا اور ہر ایک سے پوچھتا پھرتا کہ ”میرا اماں کہاں گئی ہیں؟“ ....اماں کی شفقت اور محبت سے آگے بڑھتے بڑھتے میں کالج میں جا پہنچا۔اب اماں جب جاتیں میں انہیں

میکے اپنے ماموں کے ہاں چھوڑ آتا۔وہ چند دن وہاں رہنے کے بعد پھر میرے ساتھ واپس گھر آجاتیں..........میری پھوپھی مجھے بتاتی رہتی تھیں کہ ”جب تیرے چھوٹے بھائی کی پیدائش ہوئی تو تقریباً اڑھائی برس کا تھا..........جب تو نے چھوٹے بھائی کو دیکھا تو سخت خفا ہوا۔چارپائی کے نیچے پڑی لاٹھی اٹھانے کی کوشش کرنے لگا کہ چھوٹا بھائی اماں کے پہلو میں کیوں لیٹا ہے،اس کو ماروں گا۔میں اماں کے پاس لیٹوں گا.............پھر اماں نے اپنے دوسرے پہلو میں مجھے بھی لٹا دیا..............کیونکہ میں رو دیا تھا۔اماں کا پہلو میرے لیے سب سے محفوظ پناہ گاہ اور نعمت تھا۔اماں ہمیشہ دعائیں مانگا کرتی تھیں کہ وہ اس دنیا سے چلتے پھرتے اٹھ جائیں۔کسی سے تیمارداری نہ کروانی پڑے۔حالانکہ اماں نے خود دادی اماں کی سات سال تیمارداری اور دیکھ بھال کی۔دادی اماں 115 برس کی جب ہوئیں تو بستر سے لگ گئیں۔ان کا جسم اس قدر کمزور ہو گیا تھا کہ اٹھ کر بیٹھ نہ پاتی تھیں۔انہیں برتن پکڑ کر کھانا کھلانا پڑتا تھا۔اماں نے سات برس ان کو سنبھالے رکھا تھا۔انہیں ہر دوسرے تیسرے دن نہلاتیں۔بالوں کو کنگھی کرتیں۔ان کے دانت منہ صاف کرتیں اور کپڑے تبدیل کرتیں..............اماں نے مجھ سے اور میرے چھوٹے بھائی سے وعدہ لیا تھا کہ اگر وہ وفات پا گئیں تو ہم روئیں گے نہیں۔میرا چھوٹا بھائی جب اپنی سروس کے سلسلہ میں ہزاروں میل دور سفر پر روانہ ہوا تو اماں نے اسے نصیحت کی کہ اگر خدانخواستہ تمہارے پاس گھر کی کوئی دکھ بھری خبر پہنچے تو مت رونا صبر اور تحمل سے گھر آنا..........جلد بازی نہ کرنا ....

پھر ایک دن اچانک اماں بیمار ہو گئیں۔اپنی بیماری سے کوئی مہینہ بھر پہلے انہوں نے ہماری پھوپھی جان سے کہا تھا کہ ان کی ٹانگوں میں اب سکت نہیں رہی ہے،لیکن وہ بخوبی چلتی پھرتی بھی تھیں۔آج میں سمجھتا ہوں کہ وہ زیادہ عرصہ سے بیمار تھیں لیکن انہوں نے اپنی بیماری کا کلیتاً اظہار نہیں کیا اور نہ ہی اندازہ ہونے دیا کہ وہ بیمار ہیں۔انتہائی صبر سے اپنی بیماری کو برداشت کر کے پوشیدہ رکھا۔ان کا چہرہ اتنا پر رونق،سفید تھا کہ اندازہ ہی نہ ہوتا تھا کہ ہماری اماں بیمار ہیں۔لیکن انہوں نے اپنی بیماری کا مطلق اظہار نہیں کیا اور نہ کسی کو بھانپنے دیا کہ وہ بیمار ہیں۔پہلے دن انہیں ہلکا سا بخار ہوا اور نزلہ زکام کی شکایت ہوئی مگر وہ چارپائی پر نہ لیٹیں چلتی پھرتی رہیں۔ ہلکی پھلکی بخار کی ٹیبلٹ لے لیں۔دوسرے دن بھی ان کا وہی معمول

رہا۔لیکن تیسرے دن انہیں شدید بخار نے آلیا۔بار بار پانی پیتی تھیں اور کہتی تھیں کہ ’’میری زبان خشک ہو جاتی ہے..................‘‘ ہم لوگ جب انہیں ہسپتال لے جانے لگے تو انہوں نے کہا کہ ’’مجھے ڈاکٹر کو ضرور دکھاؤ لیکن دوا میرے پیسوں کی لینا‘‘ ....شام کو چیک اپ کے بعد شوگر اور ہیپا ٹائٹس کی تشخیص ہوئی۔ہم سب لوگ گھبرا گئے۔ابا اپنی سروس کے سلسلہ میں کوئٹہ میں تھے۔یہ ان کی ریٹائرمنٹ کے بعد دوسری سروس تھی جو انہوں نے چند ماہ پہلے ہی جائن کی تھی۔ اماں نے ہمیں نصیحت کی کہ ابا کو ان کی بیماری کی اطلاع نہ دی جائے وہ پریشان ہوں گے۔لیکن ہم نے تیسرے دن اماں سے بات پوشیدہ رکھ کر ابا کو اطلاع دے دی۔اماں ہسپتال میں صرف چار دن زیر علاج رہیں پانچویں دن رات کو وہ خالق حقیقی سے جاملیں۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔میری بھابھی ان کے پاس تھیں۔انہوں نے مجھے روتے ہوئے بتایا کہ اماں اب اس دنیا میں نہیں رہی ہیں تو نہ جانے کیا بات تھی کہ مجھے مطلق رونا نہ آیا..................میں نے فون پر اپنے سب عزیزوں کو اماں کی فوتگی کی اطلاع دی...........ابا نے صبح پہنچنا تھا۔بھابھی مسلسل روئے جا رہی تھیں اور کہتی تھیں کہ اماں بے ہوشی میں بھی تجھے یاد کرتی تھیں۔پکارتی تھیں کہ..................’’میرے بیٹے نے ناشتہ کیا ہے......؟............میرے بیٹے کو چائے بنا کر دی ہے؟..................جب ہم لوگ اماں کو لے کر ہسپتال کے گیٹ سے نکل رہے تھے تو ابا بھی عین اس وقت گیٹ پر آ پہنچے۔شہر سے گھر تک لانے کے دوران مجھے بالکل رونا نہیں آیا،لیکن جب اماں کا جنازہ اٹھا تو میں اماں کی نصیحت کا پاس نہ رکھ سکا اور زار و قطار رو پڑا۔ہمیں اماں ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جا چکی تھیں۔کئی برس تک جب میں دفتر سے رات گئے گھر آتا تو دہلیز پر قدم رکھتے ہی اماں یاد آ جاتیں، کیونکہ گھر کے سب افراد سو جاتے تھے،لیکن اماں میرے انتظا میں جاگتی رہتیں۔مجھے یقین ہوتا کہ اماں برآمدے میں بیٹھی میرا انتظار کر رہی ہوں گی،لیکن پھر یاد آ جاتا کہ اماں تو فوت ہو گئی ہیں۔بچپن میں جن کی چادر کا کونہ میں اس لیے پکڑے رکھتا تھا کہ اماں نظروں سے اوجھل نہ ہوں،آج ہمیشہ کے لیے اوجھل ہو چکی تھیں۔اور راتوں کو جاگ کر میرا واپسی کا انتظار کرنے والا اب کوئی بھی نہیں ہے۔

☆☆☆☆☆

جوتے

معاشرتی رسم و رواج کے بے رحم ہنٹر زبردستی
آدمی کو کھینچ کر لے جاتے ہیں۔ضبط کرتے
کرتے ضبط کا بندھن اس طرح ٹوٹ جاتا ہے کہ پھر
عزت و وقار اور خودداری کا ہر مفہوم بے معنی ہو جاتا ہے

’’شہلا سے بھی ہزار روپیہ قرض لیا ہے۔ذکیہ باجی سے بھی ہزار روپے لائی تھی اور ....اور...........حشمت سے تو پورے چار ہزار لیے تھے...........اف...........خدایا ....یہ رقم کس طرح اتار پائیں گے؟تمہارے جوتوں کا قضیہ ابھی باقی ہے‘‘۔جلیل کی بیوی سجیلا نے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پیٹ کر جلیل سے کہا۔

جلیل جو برآمدے میں تین سال پرانا سفید دھلا ہوا شلوار قمیض کا جوڑا پہنے آہستہ آہستہ ٹہل رہا تھا،اپنے پاؤں میں پہنے بوسیدہ پھٹے ہوئے جوتوں کا بغور معائنہ کرتے ہوئے بولا:

’’رہنے دو...........سجیلا........... یہ جوتے ٹھیک ہیں۔کون میرے پاؤں کی طرف دیکھے گا!یہ جوتا جو زیادہ پھٹا ہوا نظر آ رہا ہے۔میں شادی میں جاتے ہوئے "UHU" خرید کر اس پر لگا لوں گا،گزارہ چل ہی جائے گا...........اپنے پاس رکھے ہوئے پانچ سو رہنے دو...........جس سے یہ قرض لیے ہیں،اسے واپس کر دو۔میری تنخواہ کے سولہ ہزار روپے قرضے کا اتنا بھاری بوجھ کیسے سہار پائیں گے؟‘‘

’’خدا کے واسطے کچھ عقل کرو...........‘‘سجیلا غصے سے جز بز ہو کر بولی۔

’’تمہارے منہ پر تو ناک ہی نہیں ہے...........وہاں شادی میں سب لوگ ہوں گے ....قصبے والے،...........میرے ماموں اور خالو کے بیٹے،میری بہن مہناز کا میاں........... اگر تمہارے جوتوں پر ان کی نظر پڑ گئی...........تو وہ لوگ کیا کہیں گے

..........اس سے اتنا بھی نہیں ہو پاتا کہ شادی میں تو کم از کم پھٹے جوتے پہن کر نہ آئے.......... خود تو اس کی ذرہ بھر عزت نہیں، لیکن ہماری ناک تو نہ کٹوائے۔ تم میرے رشتہ داروں اور میری بہنوں کے گھروں میں میری رہی سہی عزت بھی خاک میں ملا دو گے۔ وہ میری کزن شگفتہ سے جب اس کا میاں آصف گھر جا کر بات کرے گا کہ تمہاری بہن کا شوہر پھٹے جوتے پہن کر شادی میں آیا تھا تو پھر شگفتہ تو مجھے ہی کوسے گی۔ آخر کچھ عقل سے کام لو..........اور شرم کرو..........آدمی اس طرح دوسروں کی نظروں میں گر جاتا ہے''۔

جلیل سجیلا کی باتیں سننے پر سٹپٹا کر رہ گیا..........اس کے دماغ میں ہیجان برپا ہو گیا..........لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

''سجیلا!..........کیا کروں میں آخر؟ اس مہینہ میں ہمارے قریبی برادری اور خاندان میں چار شادیاں ہیں۔ میرے بھانجے کی شادی ہے..........اور دوسری طرف میرے بھتیجی کی رخصتی ہے۔ جو تمہاری بھی حقیقی ماموں زاد ہے..........ایک طرف تو تمہارا اصرار ہے کہ دونوں جگہوں پر معقول سلامی بھی دو..........تم بھی دلہا دلہن کو اچھی خاصی منہ دکھلائی دینے پر مصر ہو..........اور..........اور.......... یہ سب کچھ قرض سے ہو گا..........اوپر سے تم ڈانٹتی بھی ہو کہ جوتے بھی لو.......... بھلا اگر نہ لیے تو کیا ہو گا.......... پانچ چھ سو روپے تو بچ ہی جائیں گے..........''

جلیل کی باتیں سننے پر سجیلا برآمدے میں پڑی کرسی پر بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ کر کہنے لگی۔

''..........عزت تو تمہارے پاس سے بھی نہیں گزری..........خاندان میں ہر جگہ مجھے بے عزت کرواتے رہتے ہو.......... منگنی والے دن جب تم رضیہ آپا کے گھر گئے تھے تو خود ہی تمہارا کہنا تھا کہ ''تم نے اپنے پھٹے جوتے پلنگ کے نیچے رکھ کر پیچھے دھکیل دیئے تھے۔ تا کہ کسی کی نظر ان پر نہ پڑ جائے..........دن بھر تم نے ان کے ہاں سلیپر پہنے رہے اور دوسرے دن صبح گھر آتے ہوئے تم نے سب سے نظریں بچا کر جرابیں پہنی تھیں کہ پھٹی جرابوں سے جھانکتی ایڑیوں پر کسی کی نظر نہ پڑ جائے..........اب تو شادی میں جا رہے ہو..........وہاں ہمارے سب عزیز و اقارب جمع ہوں گے..........کس کس سے اپنے پھٹے جوتے چھپاتے پھرو گے؟؟؟''

''سجیلا صبر و حوصلہ سے کام لو..........حالات ہمیشہ ایک جیسے نہیں رہتے''۔ جلیل نے سجیلا کی کرسی کا بازو پکڑ کر جھک کر سجیلا کو سمجھانے کی کوشش کی..........''۔ سجیلا کا چہرہ جو پہلے ہی غصے سے تنا ہوا تھا، مزید تن گیا اور وہ ہونٹ بھینچ کر بولی۔ ''مجھے پتہ ہے..........میرے نصیب ہی خراب ہیں..........خدا نے نکھٹو کے ساتھ مقدر لکھ دیئے۔ اب تمہیں سمجھانا بے کار ہے۔ تم کنبہ برادری میں میری ناک کٹوانے پر تلے بیٹھے ہو''۔

جلیل نے سجیلا کے تیور اور لہجہ دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ وہ اب کسی صورت میں نہیں مانے گی..........اپنی ہار تسلیم کر لی..........اور کہا..........''اچھا..........لاؤ.......... پانچ سو روپے دو مجھے۔ میں اب چلتا ہوں شادی میں.......... ہاں شام کو چار بجے تم بھی آ جانا''

''..........میری فکر نہ کرو..........میں آ جاؤں گی بچوں کو لے کر، تم جاؤ..........جوتے خریدنے پر تمہارا کافی وقت لگ سکتا ہے..........رضیہ آپا ناراض نہ ہو جائیں کہ ان کا بھائی تاخیر سے پہنچا''۔ اتنا کہہ کر سجیلا کرسی سے اٹھی اور برآمدے کے بغلی کمرے سے پانچ سو روپے لا کر جلیل کو دے دیئے۔ جلیل نے پانچ سو روپے اپنی قمیض کی جیب میں ڈالے اور تیزی سے برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر زور کے ساتھ بیرونی گیٹ بند کر کے گھر سے نکل گیا۔ گیٹ زوردار طریقہ سے بند کرنے پر ''تڑاخ'' کی آواز پر سجیلا نے بخوبی اندازہ لگا لیا کہ جلیل شاید غصہ میں تھا، لیکن وہ مطمئن تھی کہ اس نے جلیل کو کم از کم نئے جوتے خریدنے پر مجبور کر دیا ہے۔

..........ہمارے معاشرے میں عام آدمی کی زندگی لامتناہی جفاؤں، قضیوں، غموں، دکھوں، محرومیوں، بے بسیوں اور بے بضاعتیوں سے عبارت ہے۔ اسے بے پناہ مصائب و آلام کا سامنا ہے۔ یہ طبقہ زندہ درگور ہے۔ ایک تو بے جا معاشرتی رسم و رواج اس کے لیے زہر قاتل ہیں..........ہمارا معاشرہ اخلاقی دیوالیہ پن کی اس نہج پر آ گیا ہے کہ فرد کسی کو اپنا ہمدرد و غمخوار نہیں پاتا..........بھرے پرے خاندان میں وہ یکہ و تنہا ہے۔ موجودہ دور کے مذہبی حلقوں اور روحانی تحریکوں نے بھی ایسی کوئی بساط نہیں بچھائی کہ خوشحال لوگ کمزور لوگوں کی مدد پر کمربستہ رہیں اور خودداری اور عزت نفس کی وجہ سے اپنی اشد مجبوریوں کا اظہار نہ کر سکنے والے بے نوا طبقہ کی زندگیوں میں کچھ آسانیاں پیدا ہوں۔ ستون دین ہوں یا سلطان دنیا، سب اپنے اپنے حال میں مست ہیں..........ایسا لگتا ہے کہ عمیق فکر رکھنے والے علمی حلقوں کو بھی

اس کا شاید کماحقہ احساس وادراک نہیں ہے۔

جلیل گھر سے نکل کر سیدھا جوتوں کی دوکان پر پہنچا۔معیاری کمپنیوں کے جوتے تو وہ شاید اپنی ریٹائرمنٹ پر بھی نہ خرید پاتا۔اسے سجیلا نے جوتے خریدنے کے لیے صرف پانچ سو روپے دیئے تھے۔چنانچہ اس نے لنڈا مارکیٹ سے جوتے خریدنے کی کوشش کی،لیکن ڈیڑھ گھنٹے کی تگ ودو کے بعد اسے احساس ہوا کہ لنڈا مارکیٹ سے بھی اسے مناسب جوتا ہزار بارہ سو روپے سے کم نہیں ملے گا..........جلیل کا اضطراب بڑھ رہا تھا..........ہر لمحہ گزرنے پر اس کی الجھن میں مزید اضافہ ہوجاتا..............آخر اس نے سوچا کہ وہ جوتے خریدنے کے بغیر ہی شادی میں چلا جائے..........مگر پھر سجیلا اس کی جو درگت بناتی وہ اس کے تصور ہی سے لرز اٹھا۔سجیلا تھی تو محنتی مگر مزاج کی بڑی سخت اور ترش تھی..........وہ اس سے الجھنا نہیں چاہتا تھا..........لیکن پانچ سو روپے میں نیا جوتا ملنا بھی ناممکن تھا..........تاہم جلیل نے اپنی پوری کوشش جاری رکھی..........دو اڑھائی گھنٹے گزر گئے..........آخر کار ایک دوکان پر اس نے ایک جوتا دیکھا جو نیا تھا،مگر استعمال شدہ تھا۔یہ غیر معیاری جوتوں کی دوکان تھی۔اس دوکان کے جوتے بعض اوقات چوتھے پانچویں دن یوں پھٹ جاتے تھے کہ ان کا تلوہ اور اوپر والا حصہ علیحدہ ہوجاتا تھا۔تاہم اگر لیتے وقت ان کی سلائی کروالی جاتی تو دو اڑھائی ماہ کے لیے گزارہ چل جاتا تھا۔جلیل کو بھی ایک ایسا جوتا درکار تھا جو کم ازکم وہ شادی میں پہن کر تو جاسکے اور واپسی پر بے شک پھٹ جائے۔اس نے اپنے پاؤں میں پہنا ہوا جوتا چھ ماہ پہلے لنڈے سے نوسو روپے میں خریدا تھا..........لیکن استعمال در استعمال ہونے والے جوتے کی پائیداری آخر کب تک ساتھ دیتی!!..........اب ان جوتوں نے پھٹنا ہی تھا۔

جلیل نے بھاؤ تاؤ کر کے اس دوکان سے استعمال شدہ جوتا چار سو روپے میں خرید ہی لیا۔سجیلا کے دیئے ہوئے پانچ سو روپوں میں سے ایک سو روپے بچ گئے تھے،جو اس نے اس خیال کے ساتھ سنبھال کر اپنی جیب میں رکھ لیے کہ کسی اشد ضرورت کے وقت کام آئیں گے..........

کیونکہ تنخواہ ملنے سے کوئی ہفتہ بھر پہلے جلیل نے رات کو کھانے کے لیے سبزی لائی تھی اور سجیلا سے کہا تھا کہ ”جلدی جلدی کھانا تیار کرو..........مجھے بھوک لگی ہوئی ہے“ لیکن گھر میں گھی نہ تھا..........بہت دیر تک سجیلا اور جلیل کے مابین تکرار ہوتی رہی کہ جلیل نے گھی کیوں نہ لایا؟..........اور پھر آخر کار سجیلا جلیل کو سخت کوستے ہوئے ”نکھٹو“ کہہ کر ہمسائی کے

ہاں جا کر آدھا پیالہ گھی مانگ لائی۔جسے اس نے کچن میں رکھ دیا..........اور خود سبزی کاٹنے بیٹھ گئی..........وائے بدنصیبی کہ ایک بڑی سے مکھی گھی کے پیالے میں پڑ کر مرگئی۔جسے جلیل کے چھوٹے بیٹے نے دیکھ کر شور مچادیا۔تو پھر جلیل کے دوسرے تین بیٹوں نے گھی کی پیالی میں ڈبکیاں کھاتی ہوئی مردہ مکھی کو باری باری آکر دیکھا اور کہنے لگے..........”اگر اس گھی سے ہنڈیا پکائی گئی تو ہم کھانا نہیں کھائیں گے“۔پلنگ پر لیٹا نقاہت زدہ جلیل پیچ وتاب کھا کر رہ گیا۔وہ خود بھی بھوکا تھا اور پورے گھر میں صرف منجھلے بیٹے نے دن کو مکئی کا ایک بھٹا کھایا تھا۔وہ بھی یوں کہ اپنی خالہ کیساتھ جو بازار چلا گیا اور خالہ نے اسے یہ بھٹا خرید کر دیا تھا..........سجیلا کو کچھ نہ سوجھ رہا تھا کہ وہ کھانا اب کیسے پکائے؟..........جلیل نے اپنے چھوٹے بیٹے کو پاس بلا کر کہا کہ وہ جا کر دوسرے ہمسائے سے گھی مانگ کر لے آئے،لیکن سجیلا برس پڑی۔

”خبردار!..........کسی کے گھر گھی مانگنے اب رات گئے مت جانا،بغیر تڑکے کے ہی سبزی پکالوں گی“..........چنانچہ اس دن سجیلا نے بغیر تڑکے کے ہی سبزی پکائی..........جلیل نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا۔شاید بھوک کی وجہ سے اسے کچھ محسوس نہ ہوا کہ سبزی بغیر تڑکے کے پکائی گئی ہے یا اسے تڑکا لگایا گیا ہے..........جلیل چاہتا تھا کہ وقتاً فوقتاً بچنے والے سو پچاس روپے وہ ایسے موقعوں کے لیے رکھ چھوڑے،لیکن ضرورتیں تھیں،کہ پوری ہی نہ ہو پاتیں اور بازار میں مہنگائی کا ایسا طوفان آیا ہوا تھا کہ دو اڑھائی سو روپے میں گھی کا بمشکل ہزار گرام والا ایک پیکٹ اور ایک کلو آٹا خریدا جاسکتا تھا۔جلیل جتنی بھی بچت کرتا اسی مناسبت سے اخراجات مزید بڑھ جاتے..........خیر..........وہ رضیہ آپا کے گھر پہنچ گیا۔رضیہ آپا جلیل کی ہمشیرہ تھیں۔جلیل کے بہنوئی پولیس کے ریٹائرڈ آفیسر تھے۔جلیل کا بھانجا جس کی شادی میں وہ شریک ہو رہا تھا ایک ادارہ میں نیا نیا آفیسر لگا تھا۔ان کے گھر میں مالی عسرت کے کوئی آثار نہ تھے۔جلیل کی ہمشیرہ کو جلیل سے بہت انس ومحبت تھی۔بھانجے بھی اپنے ماموں جلیل کو بہت چاہتے تھے..........رضیہ آپا نے جلیل کی بہت خاطر مدارت کی حالانکہ وہ شادی کے جھمیلوں میں مصروف بھی تھیں۔رضیہ آپا نے اپنے بیٹے کے ازدواجی بندھن کے ان پرمسرت لمحات سے کافی پہلے جلیل کی بیوی سجیلا کو ایک قیمتی سوٹ بھیجا تھا۔جو ساڑھے تین ہزار سے کسی طرح کم نہ تھا..........اب سجیلا کا جلیل سے اصرار تھا کہ رضیہ آپا کے بیٹے جلیل کے بھانجے کی شادی میں بطور سلامی تین ہزار روپے دیئے

جائیں..................لیکن..............لیکن.............یہ لوگ تین ہزار کہاں سے لاتے؟؟...........
معاشرتی رسم ورواج کے ہنٹر مفلوک الحال جلیل کو زبردستی ہانک کرلے جارہے تھے۔ بھلا بہن
بھائی میں بہت محبت سہی، لیکن دوسرے کی مالی عسرت کا احساس معاشرتی رسم ورواج میں بندھا
شخص کبھی نہیں کر پاتا۔ سولہ ہزار روپے ماہانہ آمدن والا تین چار بچوں کا باپ تین ہزار روپے بھلا
اپنی تنخواہ سے کیسے بچا پاتا؟..........خیر سجیلا سے بہت بحث وتمحیص کے بعد طے ہوا تھا کہ پانچ سو
روپے سجیلا دلہا دلہن کو منہ دکھائی دے گی اور پانچ سو روپے سلامی لکھوائی جائے گی۔ یہ ہزار روپے
سجیلا ہمسائی نگینہ سے قرض مانگ لائی تھی اور جلیل کے جوتوں و چند دوسری ضرورتوں کے لیے درانی
باجی سے علیحدہ ہزار روپے قرض لیا تھا..........درانی باجی نے یہ ہزار روپے اپنے پاس پڑی کمیٹی
سے اٹھا کر دیئے تھے۔ اس وعدہ پر کہ ہفتہ بعد کمیٹی سے اٹھائی گئی یہ رقم سجیلا نے درانی باجی کو واپس
کرنا ہوگی..........درانی باجی ایک عجیب عورت تھیں۔ انہیں مذہبی کتابیں پڑھنے کا شوق تھا
..........وہ رنگ رنگ کے رسالے اور کتابیں جگہ جگہ سے منگواتی رہتی تھیں۔ وہ جو بھی کتاب یا
رسالہ پڑھتیں، ان پر اسی کتاب کا رنگ چڑھ جاتا۔ کبھی وہ ذکر واذکار اور محافل میلاد پر مبنی کتابیں
پڑھ کر اپنے گھر میں ذکر و محافل منعقد کرواتیں اور پھر کوئی دوسری کتاب پڑھ کر خود ہی ذکر جلی وخفی کو
خلاف شرع قرار دیتیں..........لوگوں نے مذہب کو بھی کھیل تماشا سمجھ رکھا ہے۔ حقیقت وآگہی
کے دروازے غیر مستقل مزاج اور بے یقین لوگوں پر کبھی بھی نہیں کھل پاتے کیونکہ ان کے یقین
میں اثبات واستقامت پیدا نہیں ہو پاتی۔ استقامت والا یقین وہ بنیادی تخم ہے کہ جس کے بغیر
سب محنتیں، سب ریاضتیں اور سارا ذوق وشوق رائیگاں جاتا ہے۔

جلیل رات کو ہمشیرہ کے ہاں رہا۔ دوسرے دن جلیل کے بھانجے ''نقاش'' کی بارات
تھی۔ جلیل صبح سویرے اٹھ کر دیگوں والے کے پاس جا بیٹھا جو چیز انہیں ضرورت پڑتی وہ انہیں
منگوا دیتا..........کھانا بارہ بجے تھا۔ گھنٹہ دو گھنٹہ بعد جلیل یہاں سے اٹھا اور کھانا ہال جو شامیانے
اور قناطیں لگوا کر بنایا گیا تھا، میں کرسیاں لگواتا رہا۔ تقریباً دس ساڑھے دس بجے جلیل کے بہنوئی
اس کے پاس آئے اور بولے۔

''جلیل صاحب! آپ نے سلامی لکھنی ہے۔ کیونکہ یہ ڈیوٹی آپ ہی نبھا سکتے ہیں۔
شام 4 بجے تک شاید آپ کو ادھر بیٹھنا پڑ جائے''۔ اتنا کہہ کر انہوں

نے رجسٹر، پنسل جلیل کے حوالے کر دی۔ جلیل مہمانوں کے لیے لگائے گئے شامیانے کے سائے
میں کرسی میز لگا کر بیٹھ گیا..........اکا دکا مہمان آ رہے تھے، جو شامیانوں کے سائے میں لگی
کرسیوں پر بیٹھ جاتے اور خوش گپیوں میں مصروف ہو جاتے۔ شدید گرمیوں کے موسم کے باوجود
یہاں ٹھنڈ تھی..........تقریباً ڈیڑھ دو سوفٹ کے فاصلے سے یخ ٹھنڈے پانی والا دریا گزر رہا تھا،
جس کی وجہ سے فضا نسبتاً ٹھنڈی پڑ چکی تھی اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے شامیانوں اور قناتوں سے اندر
جھانک رہے تھے..........جلیل جو سلامی لکھنے والا رجسٹر سنبھالے شامیانہ ہال کے وسط میں بیٹھا
ہوا تھا، نے اچانک پہلو بدلا تو اس کی نظر اپنے جوتوں پر پڑ گئی تو وہ سر پیٹ کر رہ گیا۔ دونوں
جوتوں کے تلوے، ایڑیوں کی جگہ سے اوپر والے ڈھانچے سے الگ ہونے والے تھے.......... یہ
نئے جوتے بھی پھٹ گئے تھے۔ چار سو روپے میں خریدے گئے جوتوں میں اس سے زیادہ
پائیداری تو نہیں ہو سکتی تھی..........اگر سجیلا کی بہنوں یا دوسری کزنز کے کسی بچے یا میاں نے
جلیل کے جوتوں کو دیکھ لیا تو پھر بات سجیلا تک پہنچ سکتی تھی..........وہ سب لوگ سجیلا کو طعنے دیتے
اور پھر سجیلا چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیتی اور پتہ نہیں اسے کون کون سے القابات سے نوازتی
..........اس خیال کے ساتھ ہی جلیل لرز گیا..........اسے کوئی بات نہ سوجھ رہی تھی کہ وہ اس قضیے
کا کیا حل تلاش کرے؟..........آخر کار بہت سوچ بچار کے بعد جلیل اٹھا اور کرسی اٹھا کر قنات کے
ساتھ بالکل یوں جوڑ کر لگا دی کہ اس کی پشت کی جانب سے اسے کوئی شخص نہ دیکھ سکے۔ اس طرح
اس کے جوتوں کی ایڑیوں پر کسی کی نظر نہ پڑ سکتی تھی۔ یہ ایک اچھا اور کامیاب حیلہ تھا۔

دس گیارہ بجے کے لگ بھگ شادی میں آئے ہوئے مہمانوں نے سلامی لکھوانا شروع
کر دی..........جلیل کے ماموں زاد اور سجیلا کی ایک بہن کا میاں بھی آ کر جلیل کے ساتھ کرسیاں
لگا کر بیٹھ گئے..........یہی کچھ شادیوں میں ہوتا ہے لوگ دیکھتے ہیں کہ سلامی دینے کی اوسط شرح
کیا ہے اور مدعو کیے گئے مہمانوں کا حساب کر کے اندازہ لگا لیا جاتا ہے کہ سلامی کہاں تک پہنچے گی۔
یہ لوگ کمبخت گھنٹوں جلیل کے پاس بیٹھے رہے۔ جن کی وجہ سے جلیل کے لیے یہ بات مصیبت
اور مسئلہ بن گئی کہ ان کے ہوتے ہوئے جلیل اپنے حقیقی بھانجے کی شادی میں اپنی صرف پانچ سو
سلامی کس طرح لکھے؟ سلامی کی سیریل میں کوئی شخص ایسا نہ تھا کہ جس نے ہزار سے کم سلامی
لکھوائی ہو۔ اکثر لوگ دو دو تین تین ہزار سلامی لکھوا رہے تھے۔ یہ

سب جلیل کے بھانجے کے قریبی عزیز و اقارب تھے..........اور..........اور جلیل جس کا سب سے زیادہ قریبی رشتہ تھا پانچ سو روپے سب کے سامنے کیسے اپنی سلامی لکھتا؟ بہرحال خدا خدا کر دو بجے کے لگ بھگ یہ لوگ کھانا کھانے کے لیے اٹھے تو جلیل نے جھٹ پٹ اپنی سلامی لکھ ڈالی تا کہ ان کے کھانا کھا کر واپس آنے تک فہرست آگے بڑھ جائے اور ان کے لیے جلیل کے نام پر براہ راست نظر پڑنی ناممکن ہو جائے..........شام چار بجے سلامی کی میزان ایک لاکھ ستاسی ہزار روپے تک پہنچ گئی تو جلیل نے رقم گن کر سمیٹی اور رجسٹر کا میزان دکھا کر اپنے بہنوئی کے حوالے کی اور دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کے جوتوں کی ایڑیوں پر کسی کی نظر نہیں پڑی۔ وہ اس خدشہ کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتا ہوا آگے بڑھ کر دوسری کرسی پر جا بیٹھا۔ مبادا کہ اس کے جوتوں کی ایڑیاں بالکل الگ نہ ہو جائیں..........ابھی اسے بیٹھے ہوئے چند ہی لمحے گزرے تھے کہ کھانا کھلانے والی انتظامی کمیٹی کے نگران کی اس پر نظر پڑ گئی تو وہ پکار کر بولا۔

''جائیں جلیل صاحب، ہال میں جا کر کھانا کھا لیں''

جلیل سوچ میں پڑ گیا۔ اگر کھانا ہال میں جوتوں کے تلوے الگ ہو گئے تو پھر اس کی بڑی سبکی ہو گی۔ چنانچہ اس نے کہا: ''جناب..........اگر کھانا یہاں ہی منگوا دیں تو بہتر ہو گا۔ ہال میں گرمی بہت ہے..........'' ''اوہ..........ٹھیک ہے..........پھر نگران نے کمیٹی رکن کو کہہ کر کھانا منگوا کر جلیل کے سامنے میز پر رکھوا دیا۔

کھانا کھاتے ہوئے جلیل کے دماغ پر پھر جوتے سوار ہو گئے۔ چند سال پہلے وہ ایک ٹور پر پاکستان کے ایک بڑے شہر میں گیا تھا۔ اس وقت بھی اسے جوتوں کا مسئلہ درپیش تھا۔ اس کے جوتے بالکل پھٹے ہوئے تھے، جن پر جا بجا موچی نے سلائی کر رکھی تھی۔ اس بار سجیلا نے تو اسے نہ ڈانٹا، لیکن وہ خود اس ٹور پر پھٹے ہوئے جوتے پہن کر نہ جانا چاہتا تھا۔ اس موقع پر جلیل نے جوتے حاصل کرنے کی بہتیری کوشش کی، مگر ناکام رہا..........اپنے بھائی سے جوتے مانگنے گاؤں بھی گیا، لیکن بھائی نے بھی معذرت کر لی کیونکہ اس کے پاس بھی جوتوں کا ایک ہی جوڑا تھا۔ جوتوں کی تلاش میں گاؤں کے سفر پر خواہ مخواہ مزید اخراجات اٹھ گئے تھے..........وہ گاؤں سے بڑا مایوس واپس لوٹ رہا تھا کہ گاؤں کے دو معمر افراد کی گفتگو سن لی جو مویشیوں کے باڑے کے سامنے گھنے سایہ دار درخت کے سایہ میں بیٹھے لسی پیتے ہوئے

آپس میں گپیں لگا رہے تھے۔ انہوں نے اپنی گفتگو میں شہر کی دوکان کا تذکرہ کیا جہاں صرف 60 روپے میں لنڈے کے جوتے سیل لگا کر فروخت کیے جاتے تھے۔ جلیل نے وہ مقام یاد رکھ لیا اور شہر پہنچ کر سیدھا مطلوبہ دوکان پر پہنچا تو واقعی ساٹھ روپے میں جوتا فروخت ہو رہا تھا، لیکن یہ جوتے ایسے نہ تھے جو جلیل کے لیے مناسب ہوتے..........یہ جوتے تو گاؤں کے کسان خریدتے تھے، جن کی مضبوطی کی بناء پر وہ پہن کر گاؤں کے کھیتوں میں ہل جوتتے اور دیگر کام کاج کرتے تھے..........جلیل نے طوہاً و کرہاً ایک مناسب سا جوتا خرید لیا..........مگر یہ جوتا اس کے لیے عذاب بن گیا..........وہ ٹور کے قافلے کے جس شخص کے پاس کھڑا ہوتا تو وہ اس کے جوتوں کو غور سے دیکھتا..........بھلا پاؤں میں پہنے یہ متروک قسم کے جوتے وہ کتنے لوگوں کی نظروں سے چھپاتا!..........شاید سب کو معلوم ہو گیا تھا کہ جلیل نے لنڈے کے جوتے پہن رکھے ہیں..........اور تو اور..........اسے اس قافلہ کے نگران بھی ان جوتوں کی وجہ سے تحقیر آمیز نظروں سے دیکھتے اور ان کی نظروں کی چبھن اسے واضح محسوس ہوتی..........لیکن خط پیشانی تو مٹایا نہیں جا سکتا نا۔ دفعتاً جلیل کے ذہن میں خیال ابھرا..........یہ قدرت کی پلاننگ ہے۔ آدمی سب کی نظروں میں گر کر ہی تو خالق کی نظروں کو بھاتا ہے۔ اس خیال کی آمد پر یکا یک جلیل کے دل میں ایک غبارہ سا پھٹا..........اور اس کے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ جلیل نے اس طوفان پر بند باندھنے کی بہت کوشش کی، مگر ناکام رہا..........سب لوگ اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے..........دفعتاً وہ جھوٹ موٹ پکارتا ہوا پانی کا گلاس لے کر اٹھا کہ ''میری آنکھوں میں سالن پڑ گیا ہے'' اور گلاس سے آنکھوں پر پانی ڈالنے لگا..........　کھانا کھانے کے بعد جلیل اٹھ کر ادھر ادھر بے غم گھومنے لگا۔ پھٹے تلوؤں کے جوتے دیکھے جانے کا خدشہ اور سجیلا کی طرف سے سخت ڈانٹ پڑنے کا خوف اس کے ذہن سے نکل چکا تھا۔ اب تو وہ اپنے پھٹے جوتوں کی نمائش کرنا چاہتا تھا..........خوب جی بھر کر نمائش، تا کہ سب لوگ اس بے نوا، درماندہ اور غریب آدمی کے پھٹے ہوئے جوتے دیکھ لیں..........اور وہ سب کی نظروں میں گر جائے۔ اتنا گر جائے، اتنا گر جائے کہ خالق کی نظروں میں آ جائے۔

☆☆☆☆☆

بے باک بیوی

قدرت ہمیشہ اپنے بندے کے حق میں بہتر فیصلہ کرتی ہے،
لیکن بندے کوطویل وقت کے بعد احساس ہوتا ہے کہ
جس چیز کو وہ اپنے حق میں ضرر رساں سمجھتا رہا وہی
دراصل قدرت کی نعمت تھی..................فکری ہم آہنگی نہ
رکھنے کے باوجود میاں بیوی کی زندگی پرمبنی افسانہ
جو یک جان دو قالب بن گئے تھے۔

کامران وقفے وقفے سے اونگھ رہا تھا۔اس کا حلیہ بگڑا ہوا تھا۔بال الجھے اور شیو بڑھ چکی تھی۔قمیض کے دامن پر چائے یا کسی مشروب کے داغ پڑے ہوئے تھے۔آنکھوں میں سرخ ڈورے دوڑ رہے تھے۔وہ اپنے مکان کے برآمدے میں لوہے کی چارپائی پر نیم دراز تھا۔چارپائی پر بچھی ہوئی چادر پر جابجا شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔چارپائی کے نیچے اس کے سلیپر بھیگے پڑے تھے..........وہ ابھی چندمنٹ پہلے واش روم سے ہو کر آیا تھا۔اس کی بیوی نے اس کے آرام کے لیے چارپائی باہر برآمدے میں ڈال دی تھی، کیونکہ کمرے کی بند فضاء میں اس کا دم گھٹ رہا تھا۔اندر گھر کے کمروں میں اس کی بیوی جھاڑ پونچھ اور صفائی میں لگی ہوئی تھی..........کامران کو شدید ہیضہ ہو گیا تھا۔وہ کل ہسپتال سے واپس لوٹا تھا،لیکن اس کے پیٹ میں ابھی تک مروڑ اٹھ رہے تھے۔اسے بار بار واش روم میں جانے کی حاجت ہو رہی تھی۔اس نے چارپائی کے ساتھ رکھے ٹیبل پر پڑے ہوئے جگ سے او آر ایس کا آدھا پیالہ بھرا اور بمشکل گھونٹ گھونٹ کر کے حلق سے نیچے اتارا۔پھر ایک لمبی سانس بھر کر چارپائی پر پوری طرح لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔صبح کے وقت چہرے پر پڑنے والی ہلکی ہلکی دھوپ کی کرنوں کی تمازت سے بچنے کے لیے اس نے اپنا بازو گھما کر

چہرے پر اس طرح رکھ لیا کہ اس کی آنکھیں چھپ گئیں۔آنکھیں بند کرتے ہی اس کا دماغ سائیں سائیں کرنے لگا۔اندر کمرے میں فرش پر وائپر گھمانے کی ''شرشر'' کی آواز اس کے کانوں میں پڑ رہی تھی۔یہ اس کی بیوی شنیلا تھی، جو فرش صاف کر رہی تھی۔آنکھیں بند کیے ہوئے کامران کے دماغ میں اس کی بیوی کا پورا سراپا گھوم گیا۔دھان پان سی، گھٹا ہوا چست جسم، سانولی رنگت، قدرے موٹی، میانہ قد، چوکھٹ اور متناسب نقوش والا جاذب نظر چہرہ، تراشیدہ گھنی پلکیں، سانولے مگر صاف ہونٹ، سیاہی مائل چھوٹے مگر مضبوط ہاتھ چہرے کی جلد بھری ہوئی اور نکھری نکھری سی جسے میک اپ کی کوئی ضرورت نہ تھی۔کامران اب چالیس برس کا ہو چکا تھا۔اپنی زندگی کے بیس برس اس نے شنیلا کی رفاقت میں گزار دیئے تھے۔ان بیس سالوں میں گرم و سرد رفاقت کے کئی دور بیت گئے تھے۔شنیلا سے اس کی پہلی ملاقات ایک پہاڑی چشمے پر ہوئی تھی۔جہاں وہ صبح سویرے پینے کا پانی لانے گیلن لے کر گیا تھا۔چشمے کے ساتھ ہی شنیلا کا گھر تھا اور شنیلا اس وقت پانی کی ایک بڑی سی ''گاگر'' چشمے سے بھر رہی تھی۔ کامران کو پہلی ہی نظر میں وہ بھا گئی لیکن یہ بھانا اس کی پسند ہرگز نہ تھی۔اس کا جسم مضبوط اور توانا تھا۔رسمی سلام دعا کے بعد جب شنیلا پانی سے بھری گاگر اٹھا کر سر پر رکھنے لگی تو اس سے یہ اٹھائی نہ گئی، کامران نے پیش کش کی کہ ''میں گاگر اٹھا کر تمہارے سر پر رکھ دوں؟'' مگر شنیلا نے انکار کر دیا۔بڑی مشکل سے پوری قوت مجتمع کر کے ہونٹ بھینچ کر اس نے یہ وزنی گاگر اٹھا کر سر پہ رکھی اور نپے تلے قدموں کے ساتھ چلی گئی..........پھر دوسری ملاقات اس سے امتحانی سنٹر میں ہوئی تھی۔وہ میٹرک کا پیپر دے کر گھر آ رہی تھی۔پہاڑوں میں مسافت پیدل ہوتی ہے۔تنگ سی پگڈنڈیاں ہوتی ہیں، شنیلا تیزی سے مخالف سمت سے واپس گھر آ رہی تھی کہ دونوں کا آمنا سامنا ہو گیا اور وہ بمشکل ٹکراتے ٹکراتے بچے۔شنیلا نے بڑے ہمدردانہ انداز میں اس سے حال احوال پوچھا اور خیر و خیریت دریافت کی۔اس کا انداز تکلم بے باکانہ اور بے حجابانہ تھا۔بلا کی خود اعتمادی اس کے اندر بھری ہوئی تھی..........پھر دو ہی سال بعد کامران کے والدین نے انہیں رشتہ ازدواج میں باندھ دیا تھا۔یہ چٹ منگنی پٹ بیاہ والی بات ہوئی تھی..........منگنی سے چند دن بعد ایک چھ سالہ بچے نے کامران کو ایک لفافہ دیا۔کامران لاشاری نے لفافہ کھول کر برآمد ہونے والا خط پڑھا۔چند بے جوڑ اور بے ڈھنگے سے اشعار نسوانی تحریر میں لکھے ہوئے تھے، جن کا قافیہ تھا۔

’’مجھے پسند ہےتو...........اقبال بلند ہےتو‘‘............ یہ شنیلا کا پہلا خط تھا جو بڑے بے باکانہ انداز میں بغیر کسی لگی لپٹی کے لکھا گیا تھا۔شنیلا نے بلاجھجک اپنے جذبات اور پسندیدگی کا اظہار کر دیا تھا...............وہ اچھی ضرور تھی لیکن کامران کا آئیڈیل اور پسند نہ تھی۔بس اس کی والدہ نے اپنی خرابی صحت کی بناء پر کام کاج کے لیے اس کا انتخاب کیا تھا۔شنیلا کوئی خاص پڑھی لکھی نہ تھی، تاہم تھرڈ ڈویژن میٹرک پاس تھی، لیکن گھریلو کام کاج میں طاق..........کامران کو اپنی اس اچانک شادی پر بڑا دکھ اور تاسف تھا، نہ اس سے رائے لی گئی اور نہ پوچھا گیا تھا..........وہ اسے اپنے سر تھونپے جانے والا ایک وبال سمجھ رہا تھا کیونکہ اس کی سوچ شنیلا سے یکسر مختلف تھی۔جس میں کوئی ہم آہنگی یا قدر مشترک مفقود تھی..............بادل نخواستہ اس نے قسمت اور تقدیر کے آگے سر تسلیم خم کر لیا۔ابھی کامران پڑھ رہا تھا اور شنیلا اس کی پڑھائی میں مخل ہوتی تھی۔وہ کتاب کا مطالعہ کرنے لگتا تو شنیلا اسے باتیں کرنے پر مجبور کر دیتی۔وہ بڑی شوخ اور شرارتی تھی اور جسمانی قوت کے لحاظ سے قدرے کامران سے طاقتور۔وہ کبھی کبھی کشتی میں کامران کو پچھاڑ دیتی اور اپنی ضد پر اڑ کر ہار تسلیم نہ کرتی۔کامران جب شنیلا کے پچھاڑنے سے گرتا تو اسے اپنی مرادنگی کا بھرم قائم رکھنے کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ تراشنا پڑتا۔وہ کبھی کہتا کہ’’میرا پاؤں پھسل گیا تھا‘‘ کبھی جواز گھڑتا کہ’’میرے پاؤں میں موچ تھی تب گرا ہوں‘‘............ان تمام باتوں کے باوجود کامران کی وہ پسند نہ بن پائی تھی۔کامران کے دل کے کونوں کھدروں سے اکثر یہ آواز آتی کہ کیا ہی اچھا ہوتا کہ شنیلا سے اس کی شادی نہ ہوتی۔لیکن اب طوہاً وکرہاً نبھانا پڑ رہی تھی۔شنیلا کو گھریلو کام کاج میں ید طولیٰ حاصل تھا۔منٹوں میں چشمے سے پانی کی گاگر بھر کر لاتی، کھیتوں میں غلہ سمیٹتی، گھاس کاٹتی۔درخت کاٹ کر جلانے کے لیے لکڑیاں لاتی اور پھر خود ہی کلہاڑے سے یہ لکڑیاں چیر لیتی...........اور بڑے خاص اور انوکھے انداز سے توے پر روٹی پکاتی۔اس کی ہتھیلیوں پر روٹی گھڑتے ہوئے بڑی زوردار آواز پیدا ہوتی، جو دور دراز کے گھروں تک پہنچ جاتی اور عورتوں کو معلوم ہو جاتا کہ کریم جان کی بہو روٹیاں پکا رہی ہے۔لیکن اس کے باوجود کامران کے دل میں شنیلا کی قدر و منزلت پیدا نہ ہوئی۔کامران اپنی شادی کے بعد دس برس تک گاؤں میں رہا۔گو، شنیلا نے عوضی اور اعزازی طور پر گاؤں کے سکول میں دو برس ٹیچنگ کی کیونکہ وہ اس زمانے میں میٹرک پاس تھی جب گاؤں کی کوئی لڑکی مڈل

سے زیادہ نہ پڑھی ہوئی تھی، لیکن کامران کی والدہ اور بڑے بھائیوں کی سوچ تھی کہ ہم لوگوں نے شنیلا کو گھر کے کام کاج کے لیے بیاہ کر لایا ہے۔لہذا اس سے ٹیچنگ نہیں کروائیں گے۔لہذا شنیلا نے گھر والوں کے روکنے ٹوکنے پر ٹیچنگ کا پیشہ ترک کر دیا...............دراصل وہ کامران کے خاندان کی خدمت گزاری کے لیے بیاہ کر لائی گئی تھی، بھلا ٹیچنگ کیسے کرتی؟..............اس نے بھی ایک بھلی مانس کی طرح اپنے جیٹھوں اور ساس کی بات قبول کر لی اور کوئی شکوہ شکایت نہ کی۔ہاں البتہ کامران سے دبے دبے لفظوں میں ضرور اظہار کیا کہ’’اسے ٹیچنگ کا شوق ہے، مستقل تقرری بھی ہو جائے گی‘‘ لیکن کامران نے کہا’’تم خودسر ہو گئی ہو، جو ہماری بات نہیں مانتی، گھریلو کام کاج کا ہرج ہو رہا ہے۔تمہیں ٹیچنگ کرنے کی کوئی ضرورت نہ ہے‘‘ بس بے چاری شنیلا اس دن کے بعد سکول میں ٹیچنگ کے لیے نہیں گئی..............دس برس بعد کامران چند مجبوریوں کے پیش نظر گاؤں سے شہر میں شفٹ ہو گیا۔اس کی والدہ اپنی خدمت گزاری کے لیے اپنے بڑے بیٹے کے ہاں چلی گئی تھیں۔جہاں ان کے پوتے پوتیاں بھی تھیں۔کامران شہر میں ایک سرکاری ادارہ میں ملازم ہو گیا تھا۔گاؤں سے شہر آنا جانا کافی مہنگا پڑ رہا تھا۔چنانچہ وہ شنیلا کو لے کر شہر کرایہ کے مکان میں آ گیا تھا۔شنیلا کے ہاں اب دو بچوں کی پیدائش ہو چکی تھی۔شہر کا ماحول گاؤں کے ماحول سے یکسر مختلف تھا۔شنیلا کا اصرار تھا کہ بچت کر کے شہر میں زمین خریدی جائی، مگر کامران کے مالی حالات اس کی اجازت نہ دیتے تھے، کیونکہ زمین بہت مہنگی تھی۔جب شنیلا کا اصرار حد سے بڑھا تو کامران نے اسے بٹھا کر اپنی مجبوریوں کے بارہ میں سمجھایا..........بات اس کے پلے پڑ گئی تو شنیلا نے اس موقع پر کچھ کر گزرنے کا ارادہ کر لیا۔کامران کے مشورہ سے اس نے سلائی کڑھائی کا دوسالہ کورس کیا، مگر عملی طور پر کچھ کامیابی نہ ہوئی، لیکن شنیلا نے ہمت نہ ہاری اور’’بنیادی صحت‘‘ کے کورس میں داخلہ لے لیا۔اس کورس کے سلسلہ میں اسے ایک ماہ کے لیے اسلام آباد بھی جانا پڑا۔شنیلا کی ایک ماہ کی غیر حاضری نے کامران کے کانوں کی کھڑکیاں کھول دیں۔اسے پہلی بار شنیلا کی قدر و منزلت کا احساس ہوا۔بچوں کو سنبھالنا اور دیگر کام کاج نبھانا بڑا ہی مشکل تھا...........بہرحال ایک ماہ بعد شنیلا اسلام آباد سے گھر آ گئی۔اب وہ بہت ہوشیار ہو گئی تھی۔اس کے شعور نے شہر کے ماحول میں رہ کر ایک بڑی جست لگا لی تھی۔اسے ہیلتھ کے شعبہ میں کام کرنے والے ایک ادارہ میں عارضی

جاب مل گئی۔ڈیوٹی اپنے محلے میں ہی تھی۔گو یہ دوسالہ منصوبہ تھا،لیکن شنیلا کی تنخواہ مکمل بچ جاتی۔ دوسال بعداس بچت سے کامران نے ایک پلاٹ خریدلیااور یوں شنیلا کی دیرینہ آرزو پوری ہوگئی .... بعدازاں بہت کوشش وبسیار کے بعدشنیلا کوایک اورصحت سے متعلق ادارہ میں ایک سال کے لیے جاب مل گئی۔یہ انٹرنیشنل ادارہ تھااور یہاں شنیلا کواچھی خاصی معقول تنخواہ ملتی تھی۔ سال بھرمیں اتنی رقم بچ گئی کہ کامران نے کچھ اپنی تنخواہ کے خلاف قرضہ لےکرایک چھوٹا سامکان بنالیا۔اب کامران اپنے مکان میں شفٹ ہوگیا تھااورکامران کی تنخواہ سے کرایہ مکان کی مدمیں اٹھنے ولای رقم بچ رہی تھی،جس سے ان لوگوں نے گھریلوضرورت کی چھوٹی موٹی چیزیں خریدنا شروع کردی تھیں۔بلاشبہ یہ سب کچھ شنیلا کی کوششوں کا مرہون منت تھا............چارپائی پر لیٹے آنکھیں بند کیے ہوئے کامران کے دماغ میں شنیلا کا ہیولا اب روشن اورتابناک ہوگیا تھا۔چنددن قبل اسے اچانک اس بیماری نے دبوچ لیا تھااورشنیلا اس مرض میں اس کی بھرپورخدمت کررہی تھی کیونکہ اس کی والدہ اسے خدمت کے لیے ہی بیاہ کرلائی تھیں۔کامران کے دل میں شنیلا کے لیے ٹھنڈے ٹھنڈے شیریں جذبات ابھررہے تھے۔شنیلا نے اسے گزشتہ بیس سالوں میں بڑی اچھی رفاقت دی تھی............وہ تو من موجی طبیعت کا مالک تھا۔اکثر گھریلوامور سے لاپرواہ رہتا۔سب سے زیادہ دکھ اورتاسف اپنی بیماری کے ان لمحات میں اسے اپنے اوپرہورہا تھا۔گزشتہ برس شنیلا کو ہیضہ ہوا تھا،لیکن اس نے ذرہ بھرتوجہ نہیں دی تھی............اورایک دن جب شنیلا نقاہت سے نڈھال بستر پرپڑی تھی وہ خودناشتہ بناکرکھانے کے بعددفتر چلا گیا تھا۔وہ شنیلا سے ناراض تھا۔ایک معاملہ پراس سے نونک جھونک ہوگئی تھی۔شنیلا کی حالت بہت نازک تھی۔

کامران کی غیرموجودگی میں ہمسائی جوشنیلا کودیکھنے آئی تواس نے شنیلا کوانتہائی بیماری کی حالت میں قریب المرگ پایا تووہ ایک پرائیویٹ کلینک پرلے گئی۔ڈاکٹر نے شنیلا کودیکھتے ہی کہا کہ ’’اگر شنیلا کومزیدایک آدھ گھنٹہ تاخیر سے لایا جاتا تواس کی موت واقع ہوجاتی۔شنیلا کو یہ قطعی احساس نہ تھا کہ گزشتہ برس وہ اسے بستر پرقریب المرگ حالت میں چھوڑکرآفس چلا گیا تھا۔پڑوسن نے بمشکل شنیلا کوگھسیٹ گھسیٹ کرہسپتال کے گیٹ پرپہنچایا۔بیڈ پرلیٹتے ہی شنیلا بے ہوش ہوگئی۔ اسے تب ہوش آیا جب گلوکوز کی پوری ایک بوتل شنیلا کولگ چکی تھی اورنرس پڑوسن پربرس رہی تھی کہ اتنی شدید بیماری کے باوجودشنیلا کوبروقت ہسپتال کیوں نہ

پہنچایا گیا۔پڑوسن بے چاری کیا جواب دیتی!............وہ تواسے گھرمیں اکیلے بستر پرپڑے ہوئے دیکھ کرازراہ ہمدردی ہسپتال لےآئی تھی۔چھ دن ہسپتال میں داخل رہنے کے بعد کچھ بہتر ہوئی تھی اورتقریباًڈیڑھ ماہ بعداس کی سابقہ طبی حالت بحال ہوپائی تھی............اور............اور ....اب کامران کوجب خود بیماری لاحق ہوئی توشنیلا اس کی خدمت گزاری میں جت گئی تھی۔بیس برس بعدکامران کواحساس ہونے لگا کہ تقدیر کے فیصلے ہمیشہ درست ہوتے ہیں............اگروہ اپنی آئیڈیل اورپسندکی شادی کرتا تو نہ جانے وہ عورت کس خصلت اورطبیعت کی ہوتی اوران کی نہ نبھ سکتی۔

کامران سوچوں میں مستغرق تھا کہ شنیلا ہاتھ میں وائپراٹھائے کمرے سے باہرآئی اور ایک نظربھرکرلیٹے کامران کودیکھااورپھرچندلمحے سوچنے کے بعدوائپر برآمدے کی دیوار کے ساتھ ٹکاکرکامران کے پاس چارپائی پربیٹھ گئی۔اس کی کلائی پکڑکرنبض دیکھی اورپھرپوچھا............’’او آرایس پیا ہے؟‘‘’’ہاں............آدھا پیالہ‘‘ کامران نے کمزورآواز میں جواب دیا۔

’’اف............ہو............آدھا پیالہ؟‘‘ وہ تنک کربولی’’یہ پوراپینا ہے ہردوگھنٹہ بعد‘‘

پھرشنیلا نے ایک کپ بھرکرآراوایس کامران کوپلانے کے لیے اس کی کمرمیں بازو حائل کرکے اسے تقریباًزبردستی بیٹھنے کے انداز میں سیدھا کیااورپیالہ اس کے منہ سے لگادیا۔ کامران شنیلا کی گرفت سے کچھ محبوس ساہوکرساراکپ پی گیااورپھر’’اف‘‘ کہ کردوبارہ لیٹ گیا۔

شنیلا بولی’’نہیں............اب آپ بہت بہتر ہیں اورجلدٹھیک ہوجائیں گے میں کھیر اوردلیاپکاکرلاتی ہوں‘‘ کامران آنکھیں موندے ہوئے’’ہوں............ہوں‘‘ کہتا رہا،اورشنیلا اٹھ کرکچن میں چلی گئی۔ آنکھیں بندکیے ہوئے چارپائی پرلیٹے کامران کے شعور میں شنیلا کے مترنم الفاظ کاصوتی انعکاس ہورہا تھا۔شنیلا کے ساتھ روارکھے گئے اسے اپنے بعض رویوں پرسخت ندامت اورافسوس ہورہا تھااوربعض پرخوشی کااحساس رقصاں تھا۔یہ مسرت ہلکی ہلکی آنچ پرپک رہی تھی۔ایک ٹھیٹھ دیہاتی عورت اب کافی بدل گئی تھی۔شنیلا نے اپنی جاب کی وجہ سے شعوری اور فکری ارتقاء کاایک بہت بڑازینہ طےکرلیا تھا۔اب شہری زندگی کی طرزحیات پوری طرح اس میں سماگئی تھی مگرخلوص پہلے کی طرح قائم تھااوروہ تصنع سے بھی مبراتھی۔اس کاشعورگاؤں کے محدود ماحول سے نکل کراب وسیع ہوگیا تھا۔اس کی فطری ہمدردی،ایثاراور

طبیعت کا بانکپن اس شہری ماحول میں کجلانے کے بجائے مزید نکھر گیا تھا۔ وہ مردوں کے ساتھ مخاطب ہوتی یا عورتوں کے ساتھ اس کا انداز تکلم بے باکانہ ہوتا۔ محلّہ کی ہیلتھ یونٹ کی نگران رہی تھی اور محلّہ کے سب ہی گھرانے اسے پہنچانتے تھے۔ ادارہ صحت کی طرف سے ملنے والا فرسٹ ایڈ کا ساز و سامان اس نے تقریباً تین سو گھروں میں تقسیم کیا تھا۔ ان تین سو گھرانوں کے افراد کا مفصل ڈیٹا اس کے پاس تھا جو دوران سروے اس نے اکٹھا کیا تھا۔ محلّہ کی اکثر عورتیں اس سے مشورہ لیتی تھی۔ وہ روائتی اور معمولی پڑھی لکھی عورتوں کی لیڈر تھی اور ان سے شنیلا کی گاڑھی چھنتی تھی۔

کامران کے گھر میں اکثر عورتوں کی میٹنگ ہوتی اور ایک وقت میں چالیس پچاس عورتیں اور لڑکیاں جمع ہو جاتیں۔ شنیلا نے سب کو ضابطے کا پابند بنا رکھا تھا.............. کامران کو یاد پڑا کہ جب انہیں گاؤں سے شہر شفٹ ہوئے چار سال بیت گئے تھے تو ایک دن شام کے وقت برآمدے میں بیٹھے چائے پینے کے دوران باتوں باتوں میں کامران کا خریدا گیا پینٹ شرٹ کا نیا ءسوٹ ہاتھوں میں اٹھا کر شنیلا نے کہا تھا

’’میرا دل بھی چاہتا ہے کہ پینٹ شرٹ پہن کر دیکھوں‘‘

کامران نے حیرانگی سے پوچھا.......... ’’یہ شوق تمہارے دل میں کیسے پیدا ہو گیا؟‘‘

شنیلا جھٹ بولی ’’تمہیں دیکھ کر‘‘ اگر تم پہنتے ہو تو کیا میں نہیں پہن سکتی؟‘‘

یہاں لباس کے معاملہ میں بھی شنیلا کامران کی ہمسری کرنے پر تلی ہوئی تھی................ اور پھر پھر.......... اندر کمرے میں جا کر جھٹ پٹ کامران کی ہاف بازوؤں والی شرٹ اور پینٹ پہن لی اور باہر آ کر کامران سے پوچھا۔

’’دیکھو! میں کیسی لگ رہی ہوں؟‘‘ اس کا انداز تکلم بہت ہی بے باکانہ مگر پر وقار تھا.............. کامران نے کہا۔ ’’بہت اچھی.......... بالکل جوکروں جیسی‘‘۔

مگر شنیلا پر الجھاؤ کا کوئی تاثر قائم نہ ہوا اور باہر برآمدے میں بچھی کرسی پر بیٹھ کر کہنے لگی ’’جاؤ اپنا کیمرہ لاؤ اور میرے فوٹو بناؤ‘‘

کامران نے اس سے الجھنا مناسب نہ سمجھا اگر کچھ کہتا تو وہ اسے پچھاڑ کر رکھ دیتی۔ کیونکہ جسمانی طاقت کے لحاظ سے وہ اس سے کم نہ تھی۔ مگر کامران کیمرہ کے لیے نہ گیا۔ شنیلا چند ثانیے بعد خود ہی اٹھ کر کیمرہ لے آئی۔ کامران نے سوچا نہیں معلوم۔ یہ کس مٹی کی بنی ہے اور

کیا خصلتیں رکھتی ہے۔ شنیلا جو بھی پوز بنا کر فوٹو بنانے کا کہتی، وہ اس پوز میں فوٹو بناتا رہا۔ کھڑے ہوئے، گملے کے ساتھ، کرسی پر بیٹھے ہوئے، دیوار کے ساتھ، گلاب کی کیاریوں کے ساتھ مختلف انداز میں شنیلا کوئی ڈیڑھ درجن فوٹو بنوانے کے بعد مطمئن ہوئی................ وہ تصویریں آج تک شنیلا نے محفوظ رکھی ہوئی تھیں.......... کامران اس کی طبیعت کے بے باکانہ پن پر کبھی کبھی سٹپٹا جاتا مگر جلد ہی اسے احساس ہوتا کہ اس کے اس بے باکانہ پن میں ہی اس کی فطرتی جولانی اور ایثار مستور ہے۔ ایک ایسی امنگ پوشیدہ ہے، جو اسے آگے بڑھنے پر اکساتی ہے اور رکاوٹوں و دکھوں سے ٹکرانے کا حوصلہ دیتی ہے........... شنیلا نہ کبھی جھاڑ پلانے پر خفا ہوئی، نہ کسی زیادتی پر۔ نہ گاؤں میں رہنے کے دوران ملازمت چھوڑنے پر۔ نہ کبھی ڈانٹ ڈپٹ پر اس نے برا منایا۔ اگر غصہ سے بات کرو تو ایسے انداز میں ہنستی اور اپنی بے باکی کے باعث ایسا غیر متوقع جواب دے دیتی کہ غصہ کرنے والا خود اس کے جواب سے بننے والی مضحکہ خیز صورتحال پر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جاتا۔ شنیلا کو جتنا ڈانٹو، ترکی بہ ترکی جواب دے کر اپنے کام میں مگن ہو جاتی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ جو بات دل میں آئی منہ پر کہہ دی۔ اس میں مصلحت آمیزی کی کوئی رمق نہ ہوتی تھی.............. کامران کو آج انتہائی نقاہت کے عالم میں شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ قدرت کا کوئی بھی فیصلہ مصلحت سے خالی نہیں ہوتا اور ہمیشہ قدرت کے فیصلے بندے کے حق میں ایک عنایت ہوتے ہیں۔ جسے وہ اپنے سر تھوپی جانے والی بلا سمجھتا رہا تھا، وہ قدرت کی ایک انمول نعمت ثابت ہوئی تھی۔ کامران کے دل میں ایک بار پھر شنیلا کی پوری شخصیت خدوخال کے ساتھ موجود تھی۔ شنیلا کی قدر و منزلت اس کے دل میں بڑھتی چلی گئی۔ وہ اس کے بغیر بالکل مفلوج اور اپاہج تھا۔ اس کی سوچ اور حواس ہر طرف سے سمٹ کر شنیلا پر مرتکز ہو گئے تھے، جو اس کی پل پل کی ساتھی تھی۔ لمحہ لمحہ اس کا خیال رکھنے والی، ساتھ نبھانے والی، دکھ درد پر صابر و شاکر۔ کسی بھی بات اور ناروا سلوک و نوک جھونک پر ناراض نہ ہونے والی۔ بے باک و نڈر، آؤ تاؤ دیکھے بغیر دل میں آئی بات منہ پر کہنے والی، خلوص سے بھری پٹاری.......... خدمت گزار شنیلا.............. خدا کی حکمت نرالی.......... خدا کی عنایت و نعمت مصلحتوں سے معمور۔

☆☆☆☆☆

پوڑری

ہمارے معاشرے کے ایک عظیم المیے کی زہرنا
کیوں وہولنا کیوں پرمبنی ایک افسانہ جو ہمارے
طرزِ عمل اور نیتوں کے فتور کی نشاندہی کر کے
ہماری عیارانہ منافقت کو طشت ازبام کرتا ہے

مزار کے ساتھ بہنے والے برساتی نالے پر بنے پل کے نیچے زندگی کی مکروہ گہما گہمی انگڑائیاں لے رہی تھی۔ پل کے ٹھنڈے سائے میں گھاس پھونس اور بچھے ہوئے کاٹن کے گتوں پر آٹھ دس آدمی جمگھٹا لگائے بیٹھے تھے۔ان لوگوں کی قمیضیں بٹنوں سے محروم تھیں اور آستین و گریبان کھلے ہوئے تھے۔جن کے میل کچیل سے اٹے ہاتھ، بڑھی ہوئی شیو، بعض کی سرخ انگارہ آنکھیں اور دھول مٹی سے بھرے ہوئے مٹیالے سر کے بال، انہیں مزید بھیانک بنا رہے تھے..............ان لوگوں کے مضطرب و پریشان سیاہی مائل چہروں سے دوران گفتگو جب میلے پیلے دانت جھانکتے نظر آتے تو دیکھنے والے پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔

نالے کے دہانے پر یخ پانی والا دریا بہتا تھا، جس نے فضاء ٹھنڈی کر رکھی تھی۔ نالہ کا گندہ پانی انسانی آبادیوں کی تمام کثافت اور غلاظت سمیٹ کر دریا میں مل جاتا تھا۔نالے کے پانی سے پل کے نیچے ساری فضاء میں متعفن بو پھیلی ہوئی تھی، مگر جمگھٹا لگائے بیٹھے ہوئے لوگ اس قسم کی متعفن بدبودار فضاء کے تو عشروں سے عادی تھے اور یہ فضاء ان کی زندگیوں کا جزو لاینفک بن چکی تھی۔ دریا کی موجیں طلاطم میں آ کر اوپر اٹھتیں اور شاید نالے کے ساتھ بیٹھے ان لوگوں کی کراہت یا عبرت سے خوف زدہ ہو کر پھر نیچے بیٹھ جاتی تھیں..............تنور کی مانند گرم اور جھلسا دینے والی دھوپ نے سڑک کا تارکول تک پگھلا کر رکھ دیا تھا۔ زمین تپ کر تابنا بن چکی تھی ....دوپہر کی اس قیامت خیز گرمی نے اندرون شہر ٹریفک کی

آمدورفت کو گویا نگل لیا تھا۔ وقفے وقفے سے کوئی گاڑی، رکشا جب گزرتا تو احساس ہوتا کہ بس اپنی زندگی کی آخری ہچکیاں لے رہا ہے۔ سرکاری دفاتر میں ملازم بھی دبکے بیٹھے تھے۔گلیاں سنسان و ویران پڑی تھیں۔لوگوں نے بپھرے ہوئے سورج کے خوف سے گھروں میں پناہ لے رکھی تھی۔ان لوگوں میں چند لمبی ڈاڑھیوں اور لمبے بالوں والے ملنگ نما آدمی بھی جمگھٹے کی مکروہ زینت دوبالا کر رہے تھے، جو اپنی ہتھیلیوں پر جلتی ہوئی دیا سلائی سے چرس پگھلا کر اسے تمباکو کے ساتھ رگڑ رگڑ کر سگریٹوں میں بھر رہے تھے۔ایک طرف بھاری بھرکم ایک شخص کالی واسکٹ پہنے نیم دراز تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے جمگھٹے سے ایک شخص اٹھا..............لرزتے اور ڈگمگاتے قدموں کے ساتھ آگے بڑھا اور دھڑام سے بھاری بھرکم شخص کے قدموں میں گر پڑا۔جسم پر طاری لرزہ سے شاید وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ پایا تھا..............گرنے کے بعد توقع تھی کہ وہ پھر اٹھنے کی کوشش کرے گا..............مگر نہیں..............چند ساعتیں موت جیسی ویرانی لی ہوئی اس نے اپنی آنکھیں گھمائیں، جن سے مردنی مرگ جھلک رہی تھی اور پھر وہیں لیٹے لیٹے بھاری بھرکم شخص کے تلوے چاٹنے لگا..............تلوے چاٹ کر اس نے اپنا سر اوپر کیا۔ پھر دونوں ہاتھ اٹھا کے جوڑ دیئے اور بھاری بھرکم شخص سے التجائیں کرنے لگا..............بھاری بھرکم شخص جو سگریٹ کے کش لگا رہا تھا، نے اپنا ہاتھ واسکٹ کی بائیں جیب میں ڈالا اور دس دس کے تین نوٹ اس کی طرف پھینک دیئے۔جن کو تلوے چاٹنے والے نے اچک کر اٹھالیا..............پیسے لینے کے بعد ایسے لگا جیسے اس میں توانائی آ گئی ہو..............اور پھر وہ مزار کی طرف جانے والی سیڑھیاں چڑھنے لگا..............اس کے جسم پر رعشہ طاری تھا۔ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ ہر قدم پر لگتا تھا کہ اب گر جائے گا..............مگر کسی طرح جوں توں کر کے اس نے سیڑھیاں چڑھ ہی لیں..............

اور سیدھا مزار کے ساتھ واقع دفتر میں چلا گیا.............. جہاں چار پانچ کلرک بیٹھے ہوئے تھے..............اور ہاتھ باندھ کر ان سے کہنے لگا۔

”وہ سخت بھوکا ہے..............بھوک کی شدت سے چل نہیں سکتا..............شدید بیمار ہے، ان کے کتوں کا بھی نوکر ہے، تیس روپے دے دیں..............“۔

دو تین کلرک ایک ساتھ بولے۔”جا..............معاف کر بابا،..............لیکن پھر کچھ توقف کے بعد ایک نے دس اور دوسرے نے بیس کا نوٹ اسے تھما دیا

.... یہ پیسے اپنی جیب میں ڈالنے کے بعد وہ سیدھا ان دفاتر کے عقب میں چلا گیا۔
جہاں انتظامیہ کے منیجر کا دفتر تھا۔سفید کاٹن کا چمکتا دمکتا سوٹ اور کالی واسکٹ پہنے منیجر صاحب اپنے آفس کے باہر گھنے درختوں کے سائے میں کرسی پر تمکنت سے بیٹھے ہوئے تھے،جن کے دائیں بائیں دو سٹینڈ والے پنکھے بیک وقت انہیں ہوا جھول رہے تھے۔
لرزتا آدمی ان کے پاس پہنچا اور جاتے ہی ان کے قدموں میں گر پڑا اور پیر پکڑ لیے۔
منیجر صاحب نے اپنی منقش جوتیوں کو جنبش دی اور اسے لاتوں سے پرے دھکیل دیا......اور بولے
''مفت خورا............... گلے پڑ گیا.............. مال قیمتی لاؤ اور مفت بانٹ دو ....تیرے باپ کے گھر سے تو نہیں لاتا۔پیسے لے آ.................اور چقندری (ہیروئین کا کوڈ نام) لے جا.............نہیں مانتا تو ٹھکائی کرواؤں تیری.............. چرس تو مزار کے کیش بکس سے نکلتی ہے،جو لوگ بطور منت چڑھاوہ میں دیتے ہیں،تو وہ میں مستحق لوگوں میں مفت بانٹ دیتا ہوں،لیکن چقندری تو کوئی مفت نہیں دیتا''۔ منیجر کی ڈانٹ پا کر اس شخص نے مرگ زدہ آواز میں کہا۔
''جی..............سرکار..............لایا ہوں پیسے..............لایا ہوں ....''۔ اتنا کہہ کر سرعت سے منیجر کے قدموں میں دھول مٹی میں بیٹھے ہوئے اس شخص نے اپنی قمیض کی سامنے کی جیب سے ساٹھ روپے نکالے اور بمشکل کھڑا ہو کر منیجر صاحب کے ہاتھ میں دے دیئے۔منیجر صاحب نے تمکنت سے منہ بسورا اور بولے۔
''لے آیا.............. ساٹھ روپے،نکھٹو مردار.............. تمہیں ایک ہی ٹارگٹ دیا تھا کہ کمبخت منسٹر صاحب کے صاحبزادوں کو پوڈر پر لگادے،تیرے اور میرے دونوں کے وارے نیارے ہو جائیں گے۔بڑے لوگوں کے بیٹے شاہانہ مزاج ہوتے ہیں،تجھے پڑیا مفت میں ملا کرے گی،ساری کمی وہ پوری کردیں گے۔یہ لوگ تو اداروں کو اپنی ملکیت اور جاگیر سمجھتے ہیں۔ پرسوں بغیر پوچھے ان کے لڑکے لاک توڑ کر ادارہ کی گاڑی لے گئے۔دو دن بعد گاڑی کا انجن ناکارہ کر کے گاڑی واپس کی۔بھلا ان سے باز پرس کی کوئی کیسے جرات کرسکتا تھا؟؟۔ایسے پیسے والے لوگوں کو نشے پر لگا..............یہ لوگ تب ہی قابو میں آتے ہیں''۔اتنا کہہ کر منیجر نے اپنی واسکٹ کی اندرونی جیب سے ایک سگریٹ کیس نکالا..........

اسے کھولا،جو چھوٹی چھوٹی مختلف سائزوں کی قلعی کی پڑیوں سے بھرا ہوا تھا اور ایک سب سے چھوٹے سائز کی پڑیا نکال کر اس آدمی کو دے دی..............۔
رعشہ سے لرزتے آدمی نے اچک کر یہ پڑیا لے لی اور پھر لجاجت سے کہنے لگا۔
''آپ کا نوکر،مزار والوں کا نوکر،سب کا خادم،ایک سگریٹ بھی دے دیں..................''۔
منیجر صاحب کے تیور بدلے،انہوں نے غصہ سے دھول میں بیٹھے ہوئے اس شخص کو لات ماری ......اور پھر سگریٹ کے پاکٹ سے ایک سگریٹ نکال کر اس کی طرف پھینکا اور کہا۔
''جا..............دفع ہو جا یہاں سے..................نہ کام کا نہ کاج کا دشمن اناج کا ''۔اور پھر اٹھ کر چلے گئے۔
لات کی ٹھوکر سہہ کر یہ آدمی جس کا نام عبدالباری تھا،لرزتا لرزتا بمشکل اٹھا اور ڈگمگاتے قدموں کے ساتھ کچھ آگے بڑھا۔پھر بیٹھ گیا۔پڑیا کھولی،اس سے سفید سفوف اپنے ہاتھ کی ہتھیلی پر انڈیلا اور پھر سگریٹ منہ میں رکھ کر اس کا سرا اس سفوف پر رکھ کر ہوا اندر کھینچی۔چند بار ہوا کھینچنے پر سارا سفوف سگریٹ میں چلا گیا...............اور پھر وہیں بیٹھے بیٹھے سگریٹ سلگا کر گہرے گہرے کش لینے لگا۔جب سرمایے کے بل بوتے پر قومی رہنما ایوانوں میں پہنچتے ہوں تو قوم کو ''عبدالباری''جیسے تحفے ملتے ہیں..............۔عبدالباری چند سال قبل ایک ادارہ کا بانکا اوورسیئر تھا،اوپر کی آمدن بھی کافی تھی،پھر اسے ہیروئین کی ایسی لت پڑی کہ پہلے نوکری چھوٹی، پھر گھر کو بھی اس نے خیرآباد کہہ دیا۔آخر کار نالہ کے اس پل کے نیچے اس نے اپنا ٹھکانہ بنالیا۔
آمدن کا ذریعہ تو ختم ہو گیا تھا،لیکن نشہ کی طلب بڑھ گئی تھی،جس کے لیے پہلے وہ چھوٹی موٹی چوریاں کرتا رہا،جب جسم کی سکت جواب دے گئی،تو نشہ کی خاطر بھیک مانگنا شروع کر دی۔جس وقت اس نے نیا نیا نشہ شروع کیا تھا تو منیجر نے اسے منسٹر صاحب کے لڑکوں کو ہیروئین پر لگانے کا ٹارگٹ دیا تھا،کیونکہ منسٹر صاحب کے لڑکوں کا اس کے پاس اٹھنا بیٹھنا تھا،مگر عبدالباری کی بدقسمتی کہ وہ ایسا نہ کرسکا۔ منیجر کے ہاتھ بہت لمبے تھے۔اوپر سے نیچے تک منشیات فروشوں کا باقاعدہ ایک نیٹ ورک چھایا ہوا تھا۔پولیس کے اعلیٰ آفیسران اور حکومت کے اہم وکلیدی عہدے دار اس کاروبار میں ملوث تھے۔حتیٰ کہ یہ لوگ انتظامی سطح پر اتنے طاقتور تھے کہ تجارتی مال ہمسایہ ملک میں لے جانے والے ٹرکوں پر بھی منشیات سمگل کرلی جاتی تھیں اور جگ

ہنسائی کا باعث بنتی رہتی تھیں۔صحافی،ایڈیٹرز، رپورٹرز اور قلمکار، سب ان کے آگے بے بس تھے۔ ایک اخبار کے مالک نے جب یونیورسٹی کی لڑکیوں کو ہیروئن سپلائی کرتے ہوئے پکڑے جانے کی خبر چھاپی اور اس واقعے کی کڑیاں ملاتے ملاتے جب تہہ تک پہنچا تو بھونچکا رہ گیا۔حتیٰ کہ ملک کی اعلیٰ انتظامیہ بھی اس دھندے میں ملوث تھی۔ان لوگوں نے مزارات، یونیورسٹیاں اور گرلز ہاسٹلز اپنی سپلائی کے اڈے بنا لیے تھے............... کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلباء وطالبات کو پہلے نشئے پر لگانے کے لیے منشیات مفت فراہم کی جاتیں اور پھر جب وہ نشہ کے عادی ہو جاتے تو پھر ان کو من مانی قیمت پر منشیات فروخت کی جاتیں۔

کچھ عرصہ شہر میں ایک اور وبا پھیل رہی کہ بھرے بازار میں سر راہ منشیات فروشوں کے گروہ نشئے کے انجکشن کی سرنج لوگوں کو چبھو کر بھاگ جاتے۔سلیم الفطرت اخبار کے مالک نے جب تلخ حقائق تک رسائی حاصل کی تو چپ سادھ لی کیونکہ مراعات یافتہ طبقات، اعلیٰ بیوروکریٹس اور حکومتی عہدے داران تک ان منشیات فروشوں کی کڑیاں جا ملتی تھیں اور اعلیٰ انتظامی عہدے دار ان منشیات فروشوں کے ہاتھوں کھلونا بنے ہوئے تھے۔اور...............اور اس دھندے میں اعلیٰ انتظامی عہدے داروں کی بیگمات اور بہو بیٹیاں بھی ملوث تھیں۔

اگر ہم اور ہماری انتظامیہ چاہے تو انتہائی تلاش و بسیار کے باوجود ملک بھر سے ایک سو گرام ہیروئین بھی نہیں برآمد ہو سکتی...............لیکن جب آوے کا آوا ہی بگڑ جائے، نشے میں دھت مشیروں ایڈوائزروں کو پکڑنے سے نیک سیرت پولیس آفیسران کو جان کے لالے پڑ جائیں تو معاشرہ کا ہر طبقہ چپ سادھ لیتا ہے............... یہ علامات کسی قوم کے مردہ ہونے کی نشانی ہیں ....لیکن یہ آفاقی قانون ہے کہ مردہ سے جب بہت زیادہ سڑانڈ اٹھنے لگے تو اسے ٹھکانے لگا دیا جاتا ہے، جلا دیا جاتا ہے یا گہرے گڑھے میں دبا دیا جاتا ہے۔

منیجر سے ملنے والی ”چقندری“ کے کش لگانے کے بعد عبدالباری کی جان میں جان آئی۔آہستہ آہستہ جسم پر طاری لرزہ ختم ہو گیا۔اب سورج کے سائے لمبے ہوتے جا رہے تھے اور دوپہر ڈھل چکی تھی۔سڑکوں پر ٹریفک کی آمدورفت میں اضافہ ہو گیا تھا............... برساتی نالے کی پلی کے فٹ پاتھ پر دو افراد کھڑے محو گفتگو تھے...............۔نیچے پلی کے سائے میں بیٹھے افراد میں اب چند کا مزید اضافہ ہو چکا تھا، لیکن یہ اب دریا کے پل کے

سایہ میں عین دریا پر آ کر بیٹھ گئے تھے، کیونکہ پہلی والی جگہ پر دھوپ آ گئی تھی اور اب ان پر پلی سے براہ راست نظر نہیں پڑتی تھی۔سامنے مزار سے نیچے اترنے والی سیڑھیوں سے عبدالباری منیجر سے چقندری لے کر سگریٹ میں بھر کر کش لگا کر اپنے نشہ کی طلب پوری کی تھی، نیچے اتر رہا تھا۔

پلی پر کھڑے ایک آدمی نے اپنی جیب سے پاسپورٹ نکالا اور کھول کر دوسرے شخص کو دکھانے لگا کہ دفعتاً چیختے چلاتے دو بچے ایک دوسرے کے پیچھے سرپٹ بھاگتے ہوئے پلی سے گزرے۔ایک بچہ اس آدمی کے ہاتھ سے اچانک ٹکرایا جس نے اپنے ہاتھ میں پاسپورٹ پکڑ رکھا تھا۔پاسپورٹ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرا اور پلی کے حفاظتی جنگلے کو چھوتا ہوا نیچے چلا گیا اور برساتی نالے کے ساتھ اگی ہوئی سوکھی گھاس میں اٹک گیا۔جس کا پاسپورٹ گرا تھا، وہ آدمی سراسیمگی سے چلایا تو سامنے سیڑھیاں اترتے ہوئے عبدالباری پر اس کی نظریں پڑیں تو وہ اسے مخاطب کرتے ہوئے زور سے پکارا۔

”پانچ سو روپے لے لو، وہ نیچے نالے کے کنارے گھاس پر میرا پاسپورٹ گر کر اٹک گیا ہے، نکال کر لا دو...............جلدی کرو کہیں نیچے نالہ میں چلا گیا تو پھر نہیں مل پائے گا اور نالے کے پانی میں بہہ کر دریا میں چلا جائے گا“۔ سیڑھیوں سے اترتے ہوئے عبدالباری خوشی سے چلایا............ ”ابھی پکڑ کر لاتا ہوں...............لیکن پانچ سو روپے ضرور لوں گا...............“۔ پانچ سو روپے کا سن کر اس کے جسم میں توانائیاں بھر گئی تھیں۔یہ پیش کش اس کے لیے ایک بہت بڑی نعمت سے کم نہ تھی۔اس کی زندگی کی سانسوں کی طوالت جو اگلے سگریٹ تک تھی، کم از کم چار پانچ دن 500 روپے ملنے پر مزید بڑھ جاتی۔اب اس کے جسم میں توانائی بھی آ چکی تھی کیونکہ ہیروئین کی کچھ مقدار جسم میں داخل ہو چکی تھی...............لہٰذا جھومتا جھامتا عبدالباری تیزی سے سیڑھیاں نیچے اترا، نالے کے کنارے پر کھلے اوراق والا پاسپورٹ گھاس میں اٹکا ہوا واضح نظر آ رہا تھا، لیکن اس تک ہاتھ پہنچانا ناممکن تھا............... پاسپورٹ پکڑنے کے لیے عبدالباری لیٹا اور پھر اپنے دونوں ہاتھ نیچے کیے تاکہ پاسپورٹ تک پہنچ جائیں ....لیکن پاسپورٹ اس کے ہاتھوں سے اب بھی چند انچ دور تھا۔زمین، جس پر وہ لیٹا ہوا تھا، ڈھلوان سی تھی...............ان چند انچ فاصلہ کو پاٹنے کے لیے وہ تھوڑا آگے سرکا، لیکن پھر بھی اس کے ہاتھ کی انگلیاں پاسپورٹ کو نہ چھو سکیں...............لہٰذا یہ

مزید آگے سرکا تو ڈھلوان سطح زمین پر اس کا توازن بگڑ گیا اور وہ دھپ کی آواز کے ساتھ سر کے بل نیچے نالہ کے پانی میں گر گیا اور گھاس، جس پر پاسپورٹ اٹکا ہوا تھا، اپنی جڑوں سے اکھڑ کر اس کے ساتھ ہی نالہ میں چلی گئی۔ پاسپورٹ چند لمحے پانی پر تیرتا رہا اور جب نالہ کا پانی دریا میں گرا تو دریا کی تیز و تند موجوں میں پاسپورٹ غائب ہو گیا۔

پلی پر کھڑے دو افراد ایک شخص کو نالے میں گرتا دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے اور پاس کھڑی بائیک پر سوار ہو کر بھاگ نکلے۔ پانی میں گرنے کی آواز سن کر پلی کے نیچے جمگھٹا بنائے بیٹھے نشئی افراد جھومتے جھامتے اٹھے اور نالے میں جھانک کر دیکھا تو بہتے پانی میں انہیں ایک آدمی غوطے کھاتا نظر آیا۔ دفعتاً ایک نے پہچان کر پکارا۔ ''اوئے یہ تو باری ہے باری...............باری..............''۔ پھر سب شور و پکار کرنے لگے، پکڑو، بچاؤ واسطے اور دہائیاں دینے لگے۔ مگر کسی نے بھی ان کے شور و غوغا پر توجہ نہ دی۔ کیونکہ آوارہ نشئی اکثریوں ہی شور شرابا کرتے رہتے تھے چند ساعتوں بعد نالے کے پانی نے عبدالباری کو بہا کر دریا برد کر دیا..............

شام کے وقت جب منسٹر صاحب نے مزار کا معائنہ کیا اور تعمیراتی کام کے سلسلہ میں نالہ کے کناروں کا جائزہ لیا تو منیجر نے نیچے اترنے والی سیڑھیوں کے پاس انہیں کھڑے ہو کر بتایا کہ..............''پل کے نیچے ہموار سی جگہ پر نشئیوں اور پوڈریوں نے ڈیرہ جما رکھا ہے۔ ان کا ٹھکانہ ختم کرنے کے لیے اس جگہ کو پاٹ کر بلند کر کے ہموار کر دیا جائے۔ آج بھی ایک پوڈری نالہ میں گر کر مر گیا ہے۔ مزار کے نزدیک ان لوگوں کا جمگھٹا اچھا نہیں لگتا..............دربار کا تقدس بھی مجروح ہوتا ہے۔ ظالم منشیات کے بیوپاری ہماری نسلیں تباہ کر رہے ہیں''۔

منسٹر صاحب منیجر مزار کی تائید کرتے ہوئے بولے۔

''ہاں.............. یہ بہت ضروری ہے۔ یہ کام جلد ہونا چاہیے''۔ اور پھر منیجر صاحب انہیں ان کے حفاظتی گارڈوں سمیت اپنے آفس میں لے گئے، جہاں ان کے لیے پر تکلف ریفریشمنٹ کا اہتمام کیا گیا تھا''۔

☆☆☆☆☆

اجنبی بیرسٹر

برصغیر پاک و ہند مشہور بزرگ، غمزدہ و
بے نوا طبقہ کے دکھوں کا درماں، شہنشاہ
ھفت اقلیم حضرت بابا تاج الدین ناگپوری
کی زندگی کے ایک روشن گوشہ کا احوال

گھاس پھونس کی بنی، گنبد نما چھت والی جھونپڑی کے داخلی راستے کے بائیں جانب مونجھ کی چارپائی بچھی تھی، جس کا چوکھٹا بڑے بڑے بے ڈول ڈنڈوں سے بنا ہوا تھا۔ چارپائی پر تہمند سمیٹے، پگڑی باندھے آلتی پالتی مار کر بیٹھے سانولی رنگت کے موٹے سے گول مٹول شخص کو جھونپڑی کے عقب میں اُگے برگد کے دیو ہیکل درخت کی ٹھنڈی چھاؤں نے راحت کا سامان میسر کر رکھا تھا..............چارپائی سے دس پندرہ فٹ کے فاصلے پر بنے مٹی کے چولھے کے پاس ''تندیب'' نہایت پریشان و مضطرب بیٹھی تھی۔ دھوپ کی تمازت اب کافی بڑھ چکی تھی، لیکن برگد کے گھنی چھاؤں نے جھونپڑی اور اس کے مکینوں کو اپنی آغوش میں لے کر سورج کی حدت سے بچا رکھا تھا۔ چارپائی پر بیٹھے شخص کے چہرے سے بھی گہرے غم و اندوہ کے آثار ہویدا تھے۔ بجھے چولہے پر دھری خالی سیاہ کالی دیگچی کا ڈھکن زمین پر الٹا پڑا تھا، جس پر ابلے ہوئے سوکھے چاولوں کو ایک چڑیا اکھیڑنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ تندیب جو گھٹنوں میں سر دابے عمیق سوچ میں مستغرق چولہے کی باگر میں پڑی مدتوں سے ٹھنڈی ہو جانے والی راکھ میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ اچانک گردن گھما کر چارپائی پر بیٹھے ہوئے شخص کو مخاطب کر کے بولی۔

''رامن! ایک کام کرو.............. ہمارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ ہمیں ہماری زمین واپس مل سکتی ہے''۔ تندیب کی آنکھوں میں جہاں چند گھڑیاں پہلے ناامیدی و یاسیت کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ اب امید و یقین کے دیئے جگمگانے لگے تھے۔

''کس طرح؟..................کیسے؟..................کیا تیرے ہاتھ میں آلہ دین کا چراغ آ گیا ہے؟
چارپائی پر بیٹھے''رامن'' نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''ہاں..................ہاں..................آلہ دین کا چراغ نہیں بلکہ جگمگاتا سورج جس سے سب چراغ جلتے ہیں۔سب کی امیدیں برآتی ہیں۔جس سے سارا جگ منور ہوتا ہے اور خوشیوں کے دیئے دمکنے لگتے ہیں''۔

یہ کہتے ہوئے تہذیب کے چہرے پر شادمانی وسرشاری کی شکنیں ابھر آئی تھیں۔

''پہلیاں نہ بجھوا..................سیدھی بات بتا..................تو کیا سمجھتی ہے کہ ساہوکار ہماری رہن والی زمین واپس کردے گا؟؟..................کسی صورت بھی نہیں کرے گا۔اس نے ڈی سی کے ہاں زمین کی ملکیت کی نالش کر رکھی ہے..................ہم غریب، بے آسرا و بے سہارا لوگ کیسے مقدمہ لڑ سکتے ہیں..................جس کی لاٹھی اس کی بھینس..................زبردست کا ٹھینگا سر پر ....زبردست کے آگے پیش نہیں چلتی..................افسوس..................ہماری زمین بھی گئی، بیل بھی گئے..................ہمارے پلے تو کچھ نہ رہا..................بری طرح لٹ گئے ہم۔ بھلا جس کے پاس اپنی زمین نہ ہو، مویشی نہ ہوں، بھینس نہ ہو، بیلوں کی جوڑی نہ ہو، اس شخص کی زندگی بھی کوئی زندگی ہوتی ہے؟؟''

چارپائی پر بیٹھے''رامن'' نے الجھن و پچھتاوے کے عالم میں گھٹنوں پر اپنے دونوں ہاتھ مار کر روہانسی صورت بنا کر کہا۔

''ارے..................ارے..................میری سن..................پریشان نہ ہو..................
بھگوان پر بھروسہ رکھ..................ہمارے ہاں جلد ہی لکشمی ڈیرے ڈالنے والی ہے..................
ہمارے نصیب جاگنے والے ہیں..................پھر بھلے دن آئیں گے..................ہمارے پنڈ میں بھگوان کے اوتار آئے ہیں..................میں بھی ان کے چرنوں کو چھو کر آئی ہوں۔
..................وہ کنویں کے پاس جو آموں کے پیڑ ہیں......وہاں کسی نہ کسی پیڑ کے نیچے''دھونی رما'' کر بیٹھے رہتے ہیں..................تو ان کے پاس اپنی فریاد لے کر جا۔خدا کی کرپا سے ہماری گروی زمین ہمیں واپس مل جائے گی''۔ ''آخر وہ ہیں کون؟؟..................''رامن نے چارپائی سے اٹھتے ہوئے نہایت متحیر لہجے میں تہذیب سے پوچھا''۔

''بابا تاج الدین ناگپوری''۔تہذیب سرشاری سے بولی۔

''کمال کرتی ہے تو..................وہ تو دوسرے دھرم کے ہیں۔ان کے پاس میں کیسے چلا جاؤں؟؟؟''۔

''وہ مسلمانوں کے دھرم کے ہیں، تو پھر کیا ہے؟ یہ دھرم ورم کے چکر تو ہم لوگوں نے بنا رکھے ہیں..................مرہٹہ راجہ جی نے تو انہیں اپنے محل میں ٹھہرایا رہا..................مہاراجہ جی روزانہ خود ان کی قدمبوسی کرتے تھے..................کیا راجہ جی کا دھرم بھشٹ ہو گیا؟؟..................
تو ان چکروں میں نہ پڑ..................میری سن!..................اور ابھی سے جا..................وہ کسی آم کے پیڑ کے نیچے ہی بیٹھے ہوں گے..................بس اس وقت تک ان کے پاس سے نہ اٹھنا، جب تک ہماری رہن شدہ زمین ہمیں مل نہیں جاتی..................''

کافی وقت رامن اور تہذیب کے مابین تکرار ہوتی رہی۔رامن کے نزدیک تہذیب کی باتیں فضول تھیں..................وہ نامی گرامی سادھوؤں کے پاس جا چکا تھا۔مگر کہیں سے بھی کچھ حاصل نہ ہوا تھا۔ساہوکاروں کو تو سادھوؤں اور پنڈتوں کی تائید وحمایت حاصل تھی۔صرف رامن جیسے لوگ زمین پر بوجھ تھے، جنہیں دھرم کے علمبرداروں کے بقول بھگوان نے بھی ملیچھ قرار دیا تھا ....تاسف، غم، محرومی، بے بسی، بے بضاعتی اور بے توقیری نے رامن کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا اور وہ اندر سے ٹوٹ کر بکھر چکا تھا۔تاہم آخری کوشش کے طور پر اس نے تہذیب کی ترغیب پر حضرت بابا تاج الدین ناگپوریؒ کی خدمت میں حاضر ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

..................بابا تاج الدینؒ ناگپوری کو تلاش کرتے کرتے رامن، بہت تھک چکا تھا۔غضب کی گرمی میں اس کا لباس پسینے سے بھیگ گیا تھا۔دھوتی جو اس نے کندھے پر ڈال رکھی تھی، چہرے کا پسینہ پونچھے پونچھے گیلی پڑ گئی تھی۔بابا تاج الدینؒ کا کوئی ایک ٹھکانہ نہیں تھا..................وہ کبھی ایک درخت کے نیچے ہوتے تھے اور کبھی دوسرے درخت کے نیچے..................مسلمان فقیروں کا کچھ پتہ نہیں چلتا تھا، جدھر جی چاہا نکل گئے۔وہ چاشت کے وقت گھر سے نکلا تھا اور اب دوپہر ڈھل چکی تھی..................سورج آگ برسا رہا تھا اور رامن کے دل میں بھی آگ بھڑک اٹھی تھی، جس کے الاؤ لحہ بہ لحہ بڑھتے ہی چلے جا رہے تھے۔اس کے اندر بغاوت اور مسلسل بغاوت کے تیز جذبات ابھر رہے تھے۔مذہب سے اس کا یقین اٹھ چکا تھا۔آخر دنیا میں ہر بڑا

آدمی چھوٹے آدمی کو کھا کیوں رہا ہے............... بڑے بڑے جاگیردار، زمیندار، ساہوکار، مہاجن وسیع وعریض زمینوں کے مالک چھوٹے موٹے کاشتکاروں، محنت کاروں اور کسانوں کی زمین ہتھیاں کیوں لیتے ہیں۔ ان کی ہوس تو کسی طرح پوری نہیں ہوتی اور انہیں مذہبی تحفظ بھی حاصل رہتا ہے............ کیا پنڈت، اوتار، سادھوؤں کی یہی تعلیمات ہیں؟؟؟

............کیا انہیں یہ سب کچھ دکھائی نہیں دیتا؟؟

وہ اپنے دھرم پر غور کرتا رہا............. غور کرتا رہا............. اسے کچھ سجھائی نہ دیا۔ عقل عاجز آ گئی............. ساہوکار جس نے اس کی زمین رہن رکھی تھی، اس کے ہی دھرم کا تھا۔ پھر یہ ظلم آخر کیوں؟؟............. اتنی عدم مساوات کیوں؟؟۔ بھگوان تو سب کا ہے۔ سب اسی کی پیدائش اور مخلوق ہیں............. پھر بھگوان نے مظلوموں، بے نواؤں، بے سہاروں اور بے آسروں کا حق غصب کرنے والوں اور انہیں کچل کر رکھ دینے والوں کو اقتدار، طاقت، عزت وشرف کیوں دے رکھا ہے؟............. رامن تھا تو ان پڑھ، لیکن کچھ معاملہ فہم بھی تھا............. کئی سو سالوں سے مسلمان بھی اسی دیش میں رہ رہے تھے مگر مسلمانوں کے ہاں بھی وہ سب کچھ رائج تھا، جو ہندوؤں کے ہاں تھا۔ گو مسلمان مساوات کا درس دیتے تھے، کہتے تھے ہم سب برابر ہیں، لیکن عملی طور پر ایسا کوئی مظاہرہ رامن نے نہیں دیکھا تھا............. گو ان کے ہاں ذات پات نہ تھی، لیکن ذات پات کی خاموش و بے نام شکلیں موجود تھیں۔ ہندو اور مسلمان جاگیردار ساہوکار ایک جیسی خصلت وعادات رکھتے تھے............. غاصب، ظالم اور مکار۔ یہ اگر ہمدردی کا اظہار بھی کرتے تو اس کے پیچھے بھی ان کی کوئی غرض مخفی ہوتی تھی۔

مسلمانوں کے ہاں بھی بڑے لوگوں نے کم وبیش وہی طور طریقے اور انداز زندگی اپنا رکھا تھا، جو ہندوؤں کے ہاں تھا............. آخر بھگوان اور مسلمانوں کے ''اللہ'' کو یہ سب نظر نہیں آتا؟؟............. رامن کے دل ودماغ میں طوفانوں کے جھکڑ چل رہے تھے۔ کیا بھگوان کی تعلیمات یہی ہیں، اس کے اندر مذہب بیزاری اور شکوے شکائتوں کے جذبات بگولوں کی شکل اختیار کر چکے تھے............. بھلا یہ کیسا قانون ہے کہ قرض کے عوض رہن رکھی گئی زمین قرضہ چکا دینے کے بعد بھی اسے نہ مل پا رہی تھی۔ وہ اور اس کا بھائی کوڑی کوڑی کے محتاج ہو چکے تھے۔ اب زندگی کی قوت بھی اس سے چھن رہی تھی............. وہ

اور اس کی بیوی دوسروں کی زمینوں پر کولہو کے بیل کی طرح دن رات کام میں جتے رہتے .... مگر حالت یہ تھی کہ بمشکل ایک وقت کا کھانا نصیب ہوتا............. بھگوان تو سب کی ضرورت کے مطابق غلہ پیدا کرتا ہے............. آخر اس کا حصہ کون ڈکار جاتا ہے؟؟ ....اور کیوں اسے نہیں مل پاتا؟............. برسوں کی محنت شاقہ کے باوجود ان کے پاس ایک وقت کے کھانے کے سوا کچھ بچ نہ پاتا تھا اور دوسرے وقت فاقہ پڑتا تھا............. قرضہ جو رامن اور اس کے بھائی نے اصل رقم سے تین گنا زیادہ ادا کر دیا تھا، لیکن سود مرکب کی وجہ سے یہ رقم نہ صرف جوں کی توں موجود تھی بلکہ مزید بڑھی ہی چلی جا رہی تھی۔

اپنے دھرم سے وہ بیزار ہو ہی چلا تھا، لیکن مسلمانوں کے دھرم میں بھی اس نے یہی کچھ دیکھا تھا............. اسکے ساتھ کام کرنے والے اکثر مسلمان کاشتکاروں اور محنت کاروں کی حالت بھی اس جیسی ہی تھی، بلکہ اس سے بھی بدتر وفروتر مسلمان نواب تھے، جاگیردار تھے، لیکن نچلے محروم طبقہ کے مسلمانوں کی حالت ذرا اچھوتوں سے ملتی جلتی تھی............. اگر کچھ فرق تھا تو صرف یہ تھا کہ انہیں ان کے دھرم والوں نے اچھوت اور ملیچھ کا نام نہیں دیا تھا............. ورنہ تھے تو دونوں ایک جیسے............. اسے سب دھرم ایک جیسے نظر آ رہے تھے............. اس کے جذبات میں غصے کا عنصر اب پوری طرح حاوی ہو چکا تھا............. غصے سے اس کا بدن تن گیا............. خون کی گردش تیز ہو گئی............. لیکن پھر وہ رونے لگا............. غصہ کے جذبات ٹھنڈے پڑتے گئے............. اس کا شکوہ بھگوان سے تھا۔ مسلمانوں کے اللہ سے تھا ....اُس ذات سے تھا، جس نے سنسار میں بے حساب مخلوق کو پیدا کیا تھا.............

وہ بھگوان ہے یا اللہ ہے یا جو کوئی بھی ہے، اس کی ساری شکائتیں اس سے ہی تھیں، جب باطنی گہرائیوں کے ساتھ ماوراذات سے گلے شکوے کرتے کرتے اس کے جذبات کا جھکڑ کچھ سرد پڑا تو اس نے ایک آم کے پیڑ کے سایہ میں کھڑے ہو کر آنکھوں میں اتر آنے والا پسینہ پونچھا اور پھر جو سامنے دیکھا تو ایک پیڑ کے نیچے چند لوگ بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ وہ جلد جلدی آگے بڑھا تو قریب پہنچنے پر تندیب کے بتائے گئے حلیے پر اس نے حضرت بابا تاج الدین کو پہچان لیا۔ ان کے چہرے پر نگاہیں پڑتے ہی رامن کے دل میں ہوکیں اٹھنے لگیں اور وہ ان کے قدموں میں پڑ کر بلک بلک کر رونے لگا.............

پاس بیٹھے ہوئے لوگ بھی حیران و ششدر رہ گئے۔ بابا تاج الدین ناگپوریؒ نے فرمایا۔

''کیوں روتا ہے رے؟..............مل جائے گی تیری زمین..............مل جائے گی''

پھر انہوں نے اسے دلاسہ دیا تو بے تاب و مضطرب رامن کو قرار سا آ گیا۔ اسے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہ پڑی تھی۔ بابا تاج الدین بغیر کچھ بتائے سب کچھ جان گئے تھے..............وہ چپ چاپ خاموش ان کے پاس بیٹھا رہا..............اور جب مجلس برخواست ہوئی تو بابا تاج الدین نے زوردار لہجے میں اسے مخاطب کر کے ڈانٹتے ہوئے فرمایا۔

''جا.............. تو بھی چلا جا..............اپنا کام کر''

رامن تو گھر سے ہی ان کا ساتھ نہ چھوڑنے کا تہیہ کر کے آیا تھا.............. بھلا وہ کب جانے والا تھا..............ان کی بار بار کی ڈپٹ سے بھی وہ گھر نہ گیا۔ حتیٰ کہ پورا ایک ہفتہ گزر گیا.............. وہ سائے کی طرح ان کے ساتھ ساتھ لگا رہتا۔ حالات کا ستایا ہوا شخص آسانی سے نہیں مانتا..............تلخ و تند تجربات زندگی اس کے اندر حقائق جاننے کی جستجو پیدا کر دیتے ہیں..............وہ زندگی کی صداقتوں میں اتر کر انہیں کھولنا چاہتا ہے۔ اس کے دل کا غبار اور طوفان آہستہ آہستہ بیٹھتا ہے..............اسے کوئی رام نہیں کر سکتا۔ صرف نبض شناس کسی کامل فقیر کی نگاہ کیمیا سے ہی اس کے دل کی صداقت کا بیج تناور درخت بن سکتا ہے۔ ورنہ دل کی گہرائیوں میں حقائق و صداقتیں جاننے کا جذبہ، کارل مارکس، نطشے اور ہیگل جیسے لوگ پیدا کرتا ہے، جن کے افکار آفاقی و ابدی صداقتوں کو مسخ و مبہم کر دیتے ہیں..............بابا تاج الدین ناگپوریؒ نے متعدد بار اسے سختی سے سرزنش کی کہ وہ چلا جائے مگر وہ اپنی ضد پر ڈٹا رہا..............

ایک دن حضرت بابا تاج الدین ناگپوریؒ کو جلال آ گیا۔ انہوں نے اسے آم کے ایک پیڑ کے نیچے بٹھا کر جلالی لہجے میں فرمایا۔

''تو قتل ہونے آیا ہے نا..............اس درخت کے نیچے بیٹھ جا..............اٹھنا نہیں..............اگر اٹھا تو میں تجھے مار ڈالوں گا''۔

بابا تاج الدین ناگپوری کے لہجے میں اتنا گہرا اثر تھا کہ رامن درخت کے نیچے کسی پتھر کی طرح جم کر رہ گیا اور تھر تھر کانپنے لگا۔ بابا تاج الدین متواتر تین دن تک اس کی خبر گیری کرتے رہے اور تنبیہ کر کے چلے جاتے کہ ''خبردار..............یہاں سے ہلنا نہیں

..............یہیں بیٹھا رہ''۔

چوتھے دن بابا تاج الدین اسے تنبیہ کر کے اسی درخت کے سائے میں چادر اوڑھ کر لیٹ گئے..............چند ہی ساعتیں گزری تھیں کہ رامن کا بھائی اسے تلاش کرتا ہوا آیا اور دور سے ہی ''رامن بھائی..............رامن بھائی'' پکارنے لگا۔ آواز سن کر رامن اپنی جگہ پر ہی کھڑا ہو گیا، آگے نہیں بڑھا۔ بابا تاج الدین کے احکامات اس کے ذہن میں نقش ہو کر رہ گئے تھے۔ رامن کے بھائی نے جب اسے دیکھا تو وہ خوشی سے دوڑتا ہوا اس کی طرف آیا اور اس سے لپٹ گیا۔

رامن کے بھائی نے کہا کہ ''وہ کئی دنوں سے اسے تلاش کرتا پھر رہا ہے۔ ہماری رہن والی زمین ڈی سی نے ہمیں ساہوکار سے واپس دلا دی ہے۔ ساہوکار کا دعویٰ ڈی سی نے مسترد کر کے ہمارے حق میں فیصلہ سنا دیا ہے اور میں نقل حکم بھی لے چکا ہوں..............'' پھر رامن کے بھائی نے نہایت خوشی اور حیرت کے ساتھ رامن کو مخاطب کیا۔

''چند دن قبل ہمارے گھر ایک ''اجنبی بیرسٹر'' صاحب آئے اور انہوں نے پوچھا کہ ''کیا تمہارا کوئی مقدمہ ہے؟؟''..........میں نے انہیں بتایا کہ ساہوکار ہماری زمین پر قابض ہے اور جس نے ڈی سی کے ہاں اپنی ملکیت کا دعویٰ دائر کر رکھا ہے۔ ہم مفلس اور نادار لوگ وکیل بھی نہیں کر سکتے۔ ہمارے پاس وکیل کی فیس کے پیسے بھی نہیں ہیں۔''

میری بات سن کر بیرسٹر صاحب بولے۔

''لاؤ زمین کے کاغذات مجھے دو میں تمہارا مقدمہ لڑوں گا اور فیس بھی نہیں لوں گا''۔ چنانچہ میں نے کاغذات زمین ان کے حوالے کر دیئے۔ انہوں نے اپنی پہلی ہی پیشی پر مسلسل آدھا گھنٹہ بحث کی۔ ان کی بحث پر ڈی سی از حد متاثر ہوا اور ساہوکار کا دعویٰ خارج کر کے فیصلہ ہمارے حق میں دے دیا..............بیرسٹر صاحب بحث کے بعد کہیں چلے گئے۔ دوسرے دن میں نے ''نقل حکم'' لی اور بیرسٹر صاحب کو بہتیرا تلاش کیا مگر کسی سے ان کا اتا پتا نہ معلوم ہو سکا۔ کوئی وکیل ان کو نہیں جانتا تھا۔ پھر تمہاری تلاش شروع کی اور آج تیسرے دن تم ملے ہو''۔

بھائی کی باتیں سن کر رامن ہکا بکا رہ گیا اور حیرت کے عالم میں کبھی اپنے بھائی اور کبھی چادر لپیٹے لیٹے ہوئے حضرت بابا تاج الدین کو دیکھنے لگا..............چند ثانیوں بعد بابا تاج الدین نے چہرے سے چادر ہٹائی تو رامن کا بھائی پکار اٹھا..............